آنامدینۃ العلم وعلیٌ بابھا

میں شہرِ علم ہوں اور علی اس کا دروازہ (قولِ رسولؐ)
میر المومنین حضرت امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام
ے باب میں نورِ معرفت و آگہی سے لبریز پہلا علمی، فکری
ہ تحقیقی جریدہ کا سلسلہ

سال میں پانچ بار

باب العلم

زیرِ ادارت:
سید محمد علی

تمام دنیا کے انسانوں کو عموماً اور مسلمانانِ عالم کو خصوصاً نجاتِ دہندۂ انسانیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا میلادِ مسعود اور ہفتۂ وحدت مسلمین مبارک ہو

حضرت امام علی علیہ السلام نے فرمایا

حمد : بابرکت ہے وہ اللہ تعالیٰ جس کی ذات تک بلند پرواز ہمتوں کی رسائی نہیں، نہ عقل و فہم کی قوتیں اس کی حقیقت کا احاطہ کر سکتی ہیں۔ وہ ایسا اوّل ہے کہ جس کے لیے نہ کوئی نقطۂ ابتدا ہے کہ وہ محدود ہو جائے اور نہ کوئی اس کا آخر ہے کہ وہاں پہنچ کر ختم ہو جائے۔

نعت : اس نے انبیائے کرامؑ کو بہترین سونپے جانے کی جگہوں میں رکھا اور بہترین ٹھکانوں میں ٹھہرایا۔ وہ بلند مرتبہ صلبوں سے پاکیزہ شکموں کی طرف منتقل ہوتے رہے۔ جب ان میں سے کوئی گزر جانے والا گزر گیا تو دوسرا اللہ کے دین کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ یہاں تک کہ یہ الٰہی شرف محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچا جنہیں ایسے معدنوں سے جو پھلنے پھولنے کے اعتبار سے بہترین اور ایسی اصلوں سے پیدا کیا جو نشو و نما کے لحاظ سے بہت باوقار تھیں، اسی شجرے سے کہ جس سے بہت سے انبیاءؑ پیدا کیے اور جس میں سے اپنے امین منتخب فرمائے۔ ان کی عترت بہترین عترت اور قبیلہ بہترین قبیلہ اور شجرہ بہترین شجرہ ہے جو سرزمینِ حرم پر اگا اور بزرگی کے سائے میں بڑھا۔ جس کی شاخیں دراز اور پھل دسترس سے باہر ہیں۔ وہ پرہیزگاروں کے پیشوا اور ہدایت حاصل کرنے والوں کے لیے سرچشمۂ بصیرت ہیں۔ وہ ایک ایسا چراغ ہیں جس کی روشنی لو دے رہی ہے اور ایسا روشن ستارہ ہیں جس کا نور ضیاپاش اور ایسا چقماق ہیں جس کی ضو شعلہ فشاں ہے۔ ان کی سیرت (افراط و تفریط سے پاک) سیدھی راہ پر چلنا اور سنت ہدایت کرنا ہے۔ ان کا کلام حق و باطل کا فیصلہ کرنے والا اور حکم مبنی بر عدل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس وقت بھیجا کہ جب رسولوں کی آمد کا سلسلہ رکا ہوا تھا۔ بدعملی فراواں اور امتوں پر غفلت چھائی ہوئی تھی۔

دعوتِ عمل : اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے۔ روشن نشانوں پر جم کر عمل کرو۔ راستہ بالکل سیدھا ہے۔ وہ تمہیں سلامتی کے گھر (جنت) کی طرف بلا رہا ہے اور ابھی تم ایسے گھر میں ہو جہاں تمہیں اتنی مہلت اور فراغت ہے کہ اللہ کی خوشنودیاں حاصل کر سکو۔ ابھی موقع ہے کہ ابھی اعمال نامے کھلے ہوئے ہیں اور قلم چل رہے ہیں۔ بدن تندرست و توانا ہیں اور زبان آزاد ہے۔ توبہ سنی جا سکتی ہے اور اعمال قبول کیے جا سکتے ہیں۔

أنا مدينة العلم وعليٌّ بابها

میں شہر علم ہوں اور علی اس کا دروازہ (قول رسولؐ)
امیر المومنین حضرت امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام
کے باب میں نور حکمت و آگہی سے لبریز پہلو علمی، فکری
اور تحقیقی جریدے کا سلسلہ
سال میں پانچ بار

۲

باب العلم

زیر ادارت

سید محمد علی

سن اشاعت —— ربیع الاول ۱۴۰۸ ہجری

طباعت —— احمد سنز کراچی

زر تعاون سالانہ (بذریعہ رجسٹری) —— ۱۰۰ روپے

قیمت —— ۲۰ روپے

ناشر —— **بنیاد علم و آگہی**
۵۔ دیو سماج روڈ، سنت نگر، لاہور

تعاون —— **حمایت حق مبین**
۳۳، چارٹرڈ بینک چیمبرز، تالپور روڈ
کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

من مات ولم یعرف امام زمانہ مات میتۃ الجاھلیۃ

جو امام زمانہ کی معرفت کے بغیر اس دنیا سے رخصت ہوگا، جاہلیت کی موت مرے گا ۔

ھم باب العلم اور امام علی ریسرچ اکیڈمی کے استحکام
کے لئے دعاگو ھیں

WAQAR AKBAR ASSOCIATES
Architects
Planners
Engineers

2, HYDERABAD COLONY JAIL ROAD, KARACHI PHONES 415182 - 401616

باب العلم کے مندرجات کو کتابوں، رسالوں اور اخبارات، میں بلا تحریف نقل کرنے میں کوئی اخلاقی اور قانونی رکاوٹ نہیں ہے

ترتیب

۱۔ اداریہ	سید محمد علی	۵
۲۔ رسالت، نہج البلاغہ کی روشنی میں	جناب محمد باقر بہبودی	۱۱
۳۔ مقدمۂ نہج البلاغہ	جناب شیخ محمد عبدہٗ رح	۲۷
۴۔ کیا یہ حقیقت نہیں ؟	جناب سید انوار احمد بلگرامی	۳۲
۵۔ نہج البلاغہ کی جاذبیت کا راز	جناب ناصر مکارم شیرازی	۳۷
۶۔ نہج البلاغہ عقیدت خیز تحریکوں کے ماخذ کی حیثیت سے	جناب سید محمد تقی	۴۵
۷۔ علیؑ اور تنہائی	جناب ڈاکٹر علی شریعتی	۶۰
۸۔ نہج البلاغہ کا ادبی مقام	جناب سید مرتضیٰ حسین فاضلؒ	۷۴
۹۔ مستقبل کی نسلوں کے نام حضرت امام علیؑ کا پیغام	جناب سید رضی جعفر نقوی	۹۵

جریدی سلسلہ باب العلم میں شائع ہونے والے مقالات سے ادارے کا کلیتہً متفق ہونا ضروری نہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

یوم ندعوا کلّ اُناس بامامھم

قیامت کے روز ہم سب انسانوں کو ان کے آئمہ کے ناموں سے پکاریں گے۔
(القرآن)

ہم باب العلم اور امام علیؑ ریسرچ اکیڈمی کے استحکام
کے لئے دعا گو ہیں

سید عاصم رضا (اسلام آباد)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

اداریہ

معروضات

اللہ رب العالمین کا شکر کس زبان سے ادا کریں جس نے ہمارے تمام تر عجز و بے مائیگی اور ہجومِ مسائل و مشکلات کے باوصف ہمیں خدمتِ دینِ مبین اور شناختِ امیرالمومنینؑ کے پُروقار اور باسعادت علمی، فکری، تحقیقی اور ثقافتی کام کو ایک نئی نہج سے ابتدا کرنے اور امام علیؑ ریسرچ اکیڈمی کی بنیاد رکھنے کی توفیق اور ہمت ارزانی فرمائی۔

رواں ماہِ مبارک ربیع الاوّل حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے سیّد و سردار، انسانوں کے رہبرِ کامل، رحمت للعالمینؐ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے میلادِ مسعود سے منسوب ہے۔ یہ ماہِ مبارک اپنے دامن میں اس نورِ مجسمؐ کو لے کر جلوہ افروز ہوا جس کی روشنی سے سارا جہان منوّر ہو گیا۔ دنیا کی عارضی زندگی کے لیے رشد و فلاح کے دائمی الٰہی اصولوں کا اعلان ہوا اور آخرت کی حیاتِ جاودانہ کے لیے دُنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دے کر ایمان اور اعمال کی بنیاد پر مستضعفینِ عالم کو نویدِ نجات سُنائی گئی۔

قرآن کریم کا پیغام اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی جانب سے آخری پیغامِ ہدایت ہے جس کا کامل ترین نمونہ خود حضرت رسالتمآبؐ کی ذاتِ گرامی ہے یوں قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اپنی حجت تمام کر دی اور قرآنِ مبین کی حفاظت کا ذمہ خود اپنے ذمے لیا ہے۔ انسانوں کو اپنے دائرۂ اختیار کی حد تک یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ رشد و فلاح کے اُن دائمی الٰہی اصولوں کو قبول کریں یا رد کر دیں۔ آپؐ

کی سیرتِ طیبہ کیونکہ قرآن کریم کا عملی نمونہ ہے اس لیے دنیا کے تمام مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حتمی طور پر اس بات کے پابند ہیں کہ وہ افراط و تفریط کا شکار ہونے پیغام ربانی سے منہ موڑنے کی ذلت سے بچنے اور اغیار کی ذہنی اور عملی غلامی سے محفوظ رہنے کے لیے اتباعِ سنت و سیرتِ رسولِ اسلامؐ اختیار کریں۔ تاریخ گواہ ہے کہ بدقسمتی سے جب بھی مسلمانوں نے دامنِ رسالتمآبؐ سے وابستگی ترک کی رسوائی سے دوچار ہوئے۔ وابستہ پیغامِ الٰہی رہے تو بڑی سے بڑی شیطانی طاقت کو منہ کے بل گرا دیا لیکن جب راہِ ہدایت سے منحرف ہوئے تو اپنے آپ سے بھی ڈرنے لگے۔

نہج البلاغہ کے مشمولات، الٰہیات اور اسلام کے دوسرے بنیادی عقائد سے لے کر انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے گوناگوں مسائل پر حرفِ آخر کا درجہ رکھتے ہیں جس پر گنتی کے چند ناموں کو چھوڑ کر مسلمانوں کے مختلف مسالک کے قدیم و جدید علماء اور اہلِ فکر و نظر نے یکساں طور پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔

عقیدۂ توحیدِ الٰہی جسے اسلام کے بنیادی عقائد میں بھی اوّلین اور مرکزی حیثیت حاصل ہے اور باقی تمام عقائد (خواہ اُن کا تعلق اُصولِ دین سے ہو یا فروعِ دین سے) اِسی بنیادی عقیدے کی شاخیں ہیں۔ اِسی لیے توحیدِ الٰہی پر ایمان کی نوعیت اور کیفیت ہی راہِ حیات میں تعلیماتِ اسلامی سے کما حقہٗ استفادے کا راستہ استوار کرتی ہیں۔

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی ذات و صفات پر امیر المومنینؑ نے جس خوب صورت

اور دلنشین انداز میں روشنی ڈالی ہے اور شناخت الٰہی کے مشکل ترین نکات کو اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے اُسی کی بنیاد پر تمام قابلِ ذکر مسلمان علما اور فلسفیوں نے صدیوں قلم فرسائی کی ہے اور یہ عمل ہنوز جاری ہے اور انشاءاللہ رہتی دنیا تک جاری رہے گا۔

ذاتِ باری کی حقیقی شناخت کو اپنی حیات کے ہر عمل کا محور بنانے کا نتیجہ، فطری اور منطقی طور پر یہی برآمد ہوتا ہے کہ انسانوں کے تمام ترجحانات اور دلچسپیاں اُنھیں ایک مرکز پر مجتمع کر دیتی ہیں اور یوں انسان ایک خدائے واحد سے وابستہ ہونے کے سبب سے ہر غیر الٰہی قوت سے جسے قرآن کریم طاغوت کہتا ہے، بے خوف ہو جاتا ہے۔ کرۂ ارض پر حاوی آج کے خصوصی ماحول میں ذاتِ باری کی حقیقی شناخت اور ادراک ہی کفر و الحاد کے طوفانوں اور سماجی عوارض کے بڑھتے ہوئے سیلابوں کا زور توڑ سکتا ہے اور رُخ پھیر سکتا ہے۔ تمام مسلمانوں کو یہ بات مدِّ نظر رکھنا چاہیے کہ اسلام کے اعلیٰ مقاصد کی بالادستی اور روز افزوں بگڑتے ہوئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے انھیں اپنی قوتوں کو متحد رکھتے ہوئے عالمی استعماریت کی اُن کاوشوں کو ناکام بنا دینا چاہیے جو وہ مختلف مسالک کے درمیان بغض و عناد کو بڑھانے اور مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو ضعیف کرنے کے سلسلے میں کر رہے ہیں۔

”بابُ العلم“ کی اِس دوسری اشاعت میں بھی ہم نے کوشش کی ہے کہ خوب سے خوب تر کا سفر جاری رہے۔ ”بابُ العلم“ کا تو مقصد ہی طلبِ علم، فروغِ علم اور اشاعتِ علم ہے۔ امیر المومنین حضرت امام علیؑ کا ارشادِ گرامی ہے۔

"اس علم میں کوئی بھلائی نہیں جو فائدہ رساں نہ ہو اور جس علم سے کوئی فائدہ نہ پہنچے وہ اس بات کا سزاوار (حق دار) نہیں ہے کہ اُسے سیکھا جائے۔"

سو ہم ایسے ہی علم کے متلاشی ہیں اور ایسے ہی علم کا فروغ چاہتے ہیں جو ایمان اور یقین کو جلا بخشے اور عمل پر آمادہ کرے، ایسا عمل جو احیائے فکرِ دینی کا باعث ہو اور ہم اپنے آپ کو اپنے عہد اور اُس کی ضروریات سے روشناس کرا سکیں۔

باب العلم کی پہلی اشاعت پر دو انداز کے تجربے سامنے آئے ہیں۔ دونوں ہی قرینِ قیاس بھی ہیں اور فطری بھی۔ ایک اندازِ نظر کے لیے ہم فقط دُعا گو ہیں اور دوسرے اندازِ نظر نے ہمارے کام میں وسعت اور ہمت میں اضافے کے لیے دُعا اور تعاون کی پیشکش کی ہے، جس کے لیے ہم شکرگزار ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو حق و حقیقت کے راستے پر گامزن رہنے کی ہمت اور طاقت عطا فرمائے کہ وہی قادرِ مطلق ہے۔

مَوتُ العالِم مَوتُ العالَم

جہاں دینی حلقوں میں اور مختلف گروہوں کے درمیان تفرقہ اندازی اور اسلام کے اجتماعی مفاد کو نقصان پہنچانے والی شخصیات ہمیشہ موجود رہی ہیں وہاں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کوئی زمانہ بھی ایسے نیک، صالح، پاکباز اور باشعور علماء اور اہلِ فکر و نظر سے خالی نہیں رہا جو اُمت کے اجتماعی مفاد اور دشمنوں کی ریشہ

روائیوں سے مقابلے کے لیے اور اسلام کے نظری اور نظریاتی محاذوں پر مسلمانوں کی منتشر قوتوں کو مجتمع کرنے کی کاوشوں میں ہمہ وقت مستعد رہتے ہوں۔

ایسی ہی باثمر شخصیات کے ذیل میں حضرت مولانا الحاج سید مرتضیٰ حسین فاضل اعلی اللہ مقامہٗ کا نام نامی بھی آتا ہے جن کی شخصیت مسلمانوں کے درمیان اتحاد کی علامت تھی اور جو اسلام کے حوالے سے عصری تقاضوں کا بھی گہرا شعور رکھتے تھے۔ سید مرحوم کی علمی وادبی کاوشیں نصف صدی کے قریب تشنگانِ علم وادب کو سیراب کرتی رہی ہیں۔ آپ کثیر المطالعہ، عالم با عمل اور شائستہ بزرگ تھے۔ آپ کی علم شناسی کسی بھی واقفِ حال سے پوشیدہ نہیں۔ 'موت العالِم موت العالَم' کا درست اطلاق سید مرحوم جیسے علماء پر ہی ہوتا ہے۔

ہم مولانا سید مرتضیٰ حسین فاضل اعلی اللہ مقامہٗ کی وفات پر سوگوار ہیں اور مرحوم کے فرزندِ اکبر مولانا سید حسین مرتضےٰ سمیت جملہ اہلِ خاندان سے اظہارِ تعزیت کرتے ہیں اور مولانا مرحوم کے درجاتِ عالیہ اور جوارِ رحمت میں ترقی کے لیے دعاگو ہیں۔

سید محمد علی

ربیع الاول سنہ ۱۴۰۸ھ

دورانِ ہفتۂ وحدتِ مسلمین۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان

لیقوم الناس بالقسط..... رسلا مبشرین ومنذرین لئلا یکون

للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل وکان اللہ عزیزا حکیما

یقیناً ہم نے دنیا میں اپنے رسول روشن دلیلوں کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان بھی نازل فرمایا تاکہ لوگ عدل و انصاف اپنا شعار بنالیں...... ایسے رسول جو اعمال صالحہ کی پاداش میں جنت کی خوشخبری دیتے تھے اور بداعمالیوں پر دوزخ کی وعید سناتے تھے تاکہ پھر اللہ پر بندوں کی کوئی حجت باقی نہ رہے اور وہ صاحب عزت و حکمت ہے۔

واذ قال عیسیٰ ابن مریم اسرائیل انی رسول اللہ علیکم

مصدقا لما بین یدی من التوراۃ ومبشرا برسول یاتی

من بعدی اسمہ احمد

اور یاد کرو جب عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا فرستادہ ہوں۔ میں سابقہ صحیفہ آسمانی تورات کی تائید کرتا ہوں اور اپنے بعد آنے والے فرستادہ خداوندی کی آمد کی تمہیں خوشخبری دیتا ہوں جن کا نام نامی احمدؐ ہوگا۔

ہم باب العلم اور امام علیؑ ریسرچ اکیڈمی کے استحکام کے لئے دعا گو ہیں

سید ظل حسنین زیدی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

جناب محمد باقر بہبودی

عربی سے ترجمہ: سید غضنفر حسین بخاری

رسالت نہج البلاغہ کی روشنی میں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الْمَعْرُوْفِ مِنْ غَيْرِ رُؤْيَةٍ، وَالْخَالِقِ مِنْ غَيْرِ
مَنْصَبَةٍ خَلَقَ الْخَلَائِقَ بِقُدْرَتِهِ، وَاسْتَعْبَدَ الْأَرْبَابَ
بِعِزَّتِهِ، وَسَادَ الْعُظَمَاءَ بِجُوْدِهِ، وَهُوَ الَّذِيْ أَسْكَنَ الدُّنْيَا
خَلْقَهُ، وَبَعَثَ إِلَى الْجِنِّ وَالْإِنْسِ رُسُلَهُ وَوَاتَرَ إِلَيْهِمْ أَنْبِيَاءَهُ
لِيَسْتَأْدُوْهُمْ مِيْثَاقَ فِطْرَتِهِ، وَيُذَكِّرُوْهُمْ مَنْسِيَّ نِعْمَتِهِ،
وَيَحْتَجُّوْا عَلَيْهِمْ بِالتَّبْلِيْغِ، وَيُثِيْرُوْا لَهُمْ دَفَائِنَ الْعُقُوْلِ
وَيُرُوْهُمْ آيَاتِ الْمَقْدِرَةِ، مِنْ سَقْفٍ فَوْقَهُمْ مَرْفُوْعٍ، وَ
مِهَادٍ تَحْتَهُمْ مَوْضُوْعٍ، وَمَعَايِشَ تُحْيِيْهِمْ، وَآجَالٍ
تُفْنِيْهِمْ، وَأَوْصَابٍ تُهْرِمُهُمْ، وَأَحْدَاثٍ تَتَابَعُ عَلَيْهِمْ
وَلَمْ يُخْلِ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ خَلْقَهُ مِنْ نَبِيٍّ مُرْسَلٍ، أَوْ كِتَابٍ
مُنْزَلٍ، أَوْ حُجَّةٍ لَازِمَةٍ، أَوْ مَحَجَّةٍ قَائِمَةٍ۔

(۱۔ ص: ۲۹۵ ؛ ۲۔ ص: ۴۳)

حمد و ستائش بے حد اس ذاتِ واجب کو زیبا ہے جو غیر مرئی ہونے کے باوجود چشمِ بینا کا اُجالا (اور قلبِ دانا کا مکین) ہے وہ ایسا خالق ہے جسے (تخلیق کے عملِ پیہم میں) تعب و تکان لاحق نہیں۔ اُس نے اپنی قدرتِ کاملہ سے مخلوقات کو جامۂ وجود عطا فرمایا۔ اس کی خالقیتِ مطلقہ کے آگے ربوبیت کے سب دعوے داروں نے عجز و عبودیت کا

اقرار و اعتراف کیا اور عزت و جبروت کے مدعیوں نے اس کی عظمت و الوہیت کو تسلیم کیا۔ اس نے دنیا میں اپنی مخلوقات کو آباد کیا اور جنوں اور انسانوں کی طرف انبیاء کی بعثت کا سلسلہ جاری فرمایا تاکہ وہ ان سے فطرت کے عہد پر پورا اترنے کا تقاضا کریں فراموش کردہ نعمات الٰہی کی انھیں یاد دہانی فرمائیں اور تبلیغ احکام خداوندی سے ان پر اپنی حجت تمام کریں، وہ یہ انبیاء اللہ تعالیٰ کی جانب سے اہل زمین کی راہنمائی کا فریضہ لے کر دنیا میں تشریف لائے تاکہ عقل کے مخفی خزانوں اور علوم کے پوشیدہ دفینوں کو انسان کی دسترس میں لائیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر فرمودہ نشانات ـــ سروں پر آسمانوں کا بلند و بے ستون شامیانہ، پیروں کے نیچے بچھایا ہوا فرش زمین، زمین میں مہیا فرمودہ اسبابِ زیست، فنا پیغام اجلیں، بوڑھا کر دینے والے امراض اور مسلسل واقع ہونے والے حوادث دکھائیں۔ ذاتِ خالق نے اپنی مخلوق کو کبھی کسی ارسال فرمودہ نبی، نازل فرمودہ کتاب یا لازم فرمودہ حجتِ قطعی و دلیلِ روشن کے بغیر نہیں چھوڑا۔

فَاسْتَوْدَعَهُمْ فِي أَفْضَلِ مُسْتَوْدَعٍ، وَأَقَرَّهُمْ فِي خَيْرِ مُسْتَقَرٍّ، تَنَاسَخَتْهُمْ كَرَائِمُ الْأَصْلَابِ إِلَى مُطَهَّرَاتِ الْأَرْحَامِ، كُلَّمَا مَضَى مِنْهُمْ سَلَفٌ، قَامَ مِنْهُمْ بِدِينِ اللهِ خَلَفٌ (ص: ۱۳۹)

رُسُلٌ لَا تُقَصِّرُ بِهِمْ قِلَّةُ عَدَدِهِمْ، وَلَا كَثْرَةُ الْمُكَذِّبِينَ لَهُمْ، مِنْ سَابِقٍ سُمِّيَ لَهُ مَنْ بَعْدَهُ، أَوْ غَابِرٍ عَرَّفَهُ مَنْ قَبْلَهُ، عَلَى ذٰلِكَ نَسَلَتِ الْقُرُونُ، وَمَضَتِ الدُّهُورُ، وَسَلَفَتِ الْآبَاءُ، وَخَلَفَتِ الْأَبْنَاءُ۔

إِلَى أَنْ بَعَثَ اللهُ سُبْحَانَهُ مُحَمَّدًا رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ لِإِنْجَازِ عِدَتِهِ، وَإِتْمَامِ نُبُوَّتِهِ، مَأْخُوذًا

عَلَى النَّبِيِّينَ مِيثَاقُهُ، مَشْهُورَةٌ سِمَاتُهُ كَرِيمًا مِيلَادُهُ۔ (ص ۱۴۴)

ان کے مقدس نطفوں کو اللہ تعالیٰ نے مکرم ترین ارحام میں ودیعت فرمایا اور بہترین قرارگاہوں میں انہیں رکھا۔ وہ عظیم و کریم صلبوں سے طاہر و پاکیزہ رحموں کی طرف منتقل ہوتے رہے۔ جب ان میں سے کوئی اس دنیا سے رخصت ہوا تو اس کی جگہ دوسرا اس کے قائم مقام کی حیثیت سے احیائے دین خداوندی کے لیے کھڑا ہو گیا۔

یہ انبیاء وہ برگزیدگان خدا تھے جنہیں نہ کبھی اپنی کم عددی اپنے فرائض منصبی کی بجاآوری سے باز رکھ سکی اور نہ ہی مخالفین کی کثرت کبھی ان کے عمل میں سدِ راہ ہوئی۔ ان میں سے ہر سابق کو بعد میں آنے والے کے متعلق پوری اطلاع دی جاتی تھی اور ہر بعد آنے والا اپنے سابق کی طرف سے مکمل تعارف کے ساتھ تشریف لاتا تھا۔ اس نہج پر صدیاں بیتتی رہیں اور زمانے گزرتے رہے اور باپ داداؤں کی جگہ ان کے بیٹے پوتے آتے رہے۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری عہد کا ایفا فرماتے ہوئے اتمامِ رسالت اور ختمِ نبوت کی غرض سے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا جن کے بارے میں جملہ انبیائے سلف سے عہد لیا جا چکا تھا کہ وہ آنحضرت کو اپنا آقا و مولا مانیں گے اور اپنی اپنی امت کو آپ کے ختم المرسلین ہونے کی خبر دیں گے، چنانچہ آپ کے علاماتِ ظہور کو اہلِ جہاں میں شہرت دی گئی اور آپ کی تشریف آوری کو دنیا کے لیے مبارک اور باعثِ رحمت بنایا گیا۔

خَيْرُ الْبَرِيَّةِ طِفْلًا، وَأَنْجَبُهَا كَهْلًا، وَأَطْهَرُ الْمُطَهَّرِينَ شِيمَةً، وَأَجْوَدُ الْمُسْتَمْطَرِينَ دِيمَةً ۝ (ص: ۱۵۱)

آپ طفلی میں بہترینِ خلائق اور پیری میں اشرفِ اہلِ زمانہ تھے۔ طہارت و پاکیزگی میں ہر طاہر سے طاہر تر اور جود و سخا میں ہر سخی سے سخی تر تھے۔

كُلَّمَا نَسَخَ اللّٰهُ الْخَلْقَ فِرْقَتَيْنِ جَعَلَهُ فِي خَيْرِهِمَا، لَمْ

يُسْهِمُ فِيهِ عَاهِرٌ، وَلَا ضَرَبَ فِيهِ فَاجِرٌ. (ص: ۳۳۰)

جب اللہ تعالیٰ نے نسلِ انسانی کو شاخوں میں تقسیم فرمایا تو آپ کے نورِ مقدس کو ہمیشہ پاکیزہ ترین شاخ میں قرار دیا۔ آپ کے نسبِ اقدس و اطہر میں کبھی کسی بدکار کی شرکت یا کسی بدکردار و فاجر کا دخل نہیں رہا۔

فَأَخْرَجَهُ مِنْ أَفْضَلِ الْمَعَادِنِ مَنْبِتاً، وَأَعَزِّ الْأَرُومَاتِ
مَغْرِساً، مِنَ الشَّجَرَةِ الَّتِي صَدَعَ مِنْهَا أَنْبِيَاءَهُ وَانْتَجَبَ
مِنْهَا أُمَنَاءَهُ، عِتْرَتُهُ خَيْرُ الْعِتَرِ، وَأُسْرَتُهُ خَيْرُ الْأُسَرِ،
وَشَجَرَتُهُ خَيْرُ الشَّجَرِ، نَبَتَتْ فِي حَرَمٍ، وَبَسَقَتْ فِي كَرَمٍ
لَهَا فُرُوعٌ طِوَالٌ، وَثَمَرٌ لَا يُنَالُ، أَغْصَانُهَا مُعْتَدِلَةٌ،
وَثِمَارُهَا مُتَهَدِّلَةٌ، مَوْلِدُهُ بِمَكَّةَ، وَهِجْرَتُهُ بِطَيْبَةَ
عَلَا بِهَا ذِكْرُهُ وَامْتَدَّ مِنْهَا صَوْتُهُ. (۹۴- ص: ۲۳۰)

خداوندِ عالم نے آپ کے نخلِ وجود کو پاکیزہ ترین مٹی سے اگایا اور شجرۂ انسانی کی اس معزز ترین شاخ سے آپ کو پیدا فرمایا جس سے انبیاء پیدا کیے اور اپنی وحی کے امین منتخب فرمائے۔ آپ کی عترتِ طاہرہ بہترین عترتہائے عالم اور آپ کا مقدس شجرہ عالمِ انسانی کے تمام شجروں سے افضل و اشرف ہے جو سرزمینِ حرم میں پیدا ہوا اور چشمۂ مجد و شرافت سے سیراب ہو کر بنی نوعِ انسان پر سایہ فگن ہوا۔ اس شجرۂ کریمہ کی شاخیں بلند ہیں اور اس کا پھل (نااہل انسانوں کی) دسترس سے بالاتر ہے۔ اس شجرۂ نبوت کی شاخیں (یعنی افرادِ قدسیہ اہلِ بیتِ رسول حاملِ علم و حکمتِ نبوی ہونے کی وجہ سے افراط و تفریط سے مبرا اور صاحبِ روش) معتدل و مستقیم ہیں اور اس کا ثمرِ حکمت آگیں طالبینِ حق و عرفان کے لیے جھکا ہوا ہے۔ یہ شجرۂ کریمہ سرزمینِ مکہ میں پیدا ہوا اور مدینے کی طرف اس نے نقلِ مکانی کیا جہاں (یہ) پروان چڑھا اور اس کی فیضِ رسانی کا چرچا ہوا (اس کے پیغام کا بول بالا

ہوا اور اس کی دعوت عالم گیر ہوئی۔

أَرْسَلَهُ بِحُجَّةٍ كَافِيَةٍ، وَمَوْعِظَةٍ شَافِيَةٍ، وَدَعْوَةٍ
مُتَلَافِيَةٍ، أَظْهَرَ بِهِ الشَّرَائِعَ الْمَجْهُولَةَ، وَقَمَعَ بِهِ الْبِدَعَ
الْمَدْخُولَةَ، وَبَيَّنَ بِهِ الْأَحْكَامَ الْمَفْصُولَةَ: (ص، ۲۳۰)

اللہ تعالیٰ نے آپ کو مکمل اور قطعی دلیل (امراضِ روحانی کو دور کرنے والی) شفا بخش پند و ہدایت اور (جہالت دور کرنے والا) پیغام دے کر مبعوث فرمایا آپ کے وجود کے ذریعے اس نے شریعت کی فراموش شدہ تعلیمات کو زندہ کیا، انسانی معاشرہ میں سرایت شدہ بدعتوں (اور جہالتوں) کو ختم کیا اور احکام خداوندی کو واضح کیا۔

أَرْسَلَهُ بِالدِّينِ الْمَشْهُورِ، وَالْعَلَمِ الْمَأْثُورِ، وَالْكِتَابِ
الْمَسْطُورِ، وَالنُّورِ السَّاطِعِ، وَالضِّيَاءِ اللَّامِعِ، وَالْأَمْرِ
الصَّادِعِ، إِزَاحَةً لِلشُّبُهَاتِ، وَاحْتِجَاجاً بِالْبَيِّنَاتِ،
وَتَحْذِيراً بِالْآيَاتِ، وَتَخْوِيفاً بِالْمَثُلَاتِ، وَالنَّاسُ فِي فِتَنٍ
انْجَذَمَ فِيهَا حَبْلُ الدِّينِ، وَتَزَعْزَعَتْ سَوَارِي الْيَقِينِ،
وَاخْتَلَفَ النَّجْرُ، وَتَشَتَّتَ الْأَمْرُ، وَضَاقَ الْمَخْرَجُ، وَعَمِيَ
الْمَصْدَرُ، فَالْهُدَى خَامِلٌ، وَالْعَمَى شَامِلٌ، عُصِيَ
الرَّحْمٰنُ، وَنُصِرَ الشَّيْطَانُ، وَخُذِلَ الْإِيمَانُ، فَانْهَارَتْ
دَعَائِمُهُ، وَتَنَكَّرَتْ مَعَالِمُهُ، وَدَرَسَتْ سُبُلُهُ، وَعَفَتْ
شُرُكُهُ، أَطَاعُوا الشَّيْطَانَ فَسَلَكُوا مَسَالِكَهُ، وَوَرَدُوا
مَنَاهِلَهُ، بِهِمْ سَارَتْ أَعْلَامُهُ، وَقَامَ لِوَاؤُهُ فِي فِتَنٍ

دَاسَتْهُمْ بِأَخْفَافِهَا، وَوَطِئَتْهُمْ بِأَظْلاَفِهَا، وَقَامَتْ عَلَى سَنَابِكِهَا فَهُمْ فِيهَا تَائِهُونَ حَائِرُونَ جَاهِلُونَ مَفْتُونُونَ، فِي خَيْرِ دَارٍ، وَشَرِّ جِيرَانٍ، نَوْمُهُمْ سُهُودٌ، وَكُحْلُهُمْ دُمُوعٌ، بِأَرْضٍ عَالِمُهَا مُلْجَمٌ، وَجَاهِلُهَا مُكْرَمٌ۔ (ص: ۶۶-۶۷)

اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کو ایک ایسے دین کے ساتھ جس کا چرچا انبیائے سلف کرتے آئے تھے، ایسی نشانیوں کے ساتھ جن کا ذکر برگزیدگانِ خدا تواتر سے فرماتے آئے تھے اور ایسی کتاب کے ساتھ جس کا نسخہ لوحِ محفوظ سے حاصل کیا گیا تھا مبعوث فرمایا اور (بصارت افروز و بصیرت آفریں) نورِ تاباں کی ضو فشانیوں کے جلو میں آپ کو آخری، قطعی اور فیصلہ کن امر کے ساتھ بھیجا تاکہ مشرکانہ شکوک و توہمات کا ازالہ ہو اور واضح دلائل کی قوت سے حقائق کو ثابت کیا جائے۔ آیاتِ الٰہی کے ذریعے گمراہ انسان کو ڈرا کر اور پچھلی اُمتوں پر نازل ہونے والے آسمانی عذابوں کے ذکر سے خوف دلا کر اسے راہِ راست پر لایا جائے۔ آپ ایسے دور میں تشریف لائے جو انسان کے (اخلاقی اور معاشرتی) فساد کا دور تھا جس میں یقین و ایمان کے ستون متزلزل، دین کے روابط شکستہ، اس کی حدود و اقدار پامال، اس کی وحدت پارہ پارہ اور اس کے احکام کا شیرازہ درہم و برہم تھا۔ اس (فکری و اخلاقی انحطاط کے گورکھ دھندے) سے نکلنے کی تمام راہیں تنگ اور تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں، وسیلۂ ہدایت مفقود تھا اور ضلالت و گمراہی عام تھی۔ اللہ تعالے کی نافرمانی اور شیطان سے تعاون کھلے بندوں کیا جا رہا تھا۔ ایمان ذلیل و خوار اور بے سہارا تھا، اس کے تمام ستون منہدم تھے اور اس کے آثار و علامات ناقابلِ شناخت ہو چکے تھے۔ وہ اپنا تشخص کھو چکا تھا اس کے رستے ویران تھے اور شاہراہیں اس کی اُجڑ چکی تھیں لوگوں نے شیطان کی اطاعت اختیار کر لی تھی اور اسی کی راہ پر چل نکلے تھے۔ ان کے اس تعاون سے شیطان

کی سرکشی اور اس کے طاغوتی اعمال کو فروغ ملا اور اس کی بغاوت و نافرمانی کے جھنڈوں کے پھریرے فضا میں مزید اونچے لہرانے لگے۔ (بالآخر) انسان ایسے فتنوں میں مبتلا ہو گیا جنھوں نے وحشی جانوروں کی طرح اس کی شرافت کی ہر قدر کو اپنے سموں تلے روند دیا اور کچل کے رکھ دیا۔ وہ لوگ ان فتنوں کے ازدحام میں حیران و سرگرداں اور پابستہ و گرفتار تھے وہ دنیا کے بہترین مقام (خانۂ خدا) کے بدترین پڑوسی تھے جن کی نیند بے خوابی اور آنکھ کا سرمہ آنسو تھے۔ یہ ایسی سرزمین تھی جہاں عالم دہن بستہ و ذلیل اور جاہل گستاخ و معزز تھا۔

أَرْسَلَهُ عَلَى حِينِ فَتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ، وَطُولِ هَجْعَةٍ مِنَ
الْأُمَمِ، وَاعْتِزَامٍ مِنَ الْفِتَنِ، وَانْتِشَارٍ مِنَ الْأُمُورِ، وَتَلَظٍّ
مِنَ الْحُرُوبِ، وَالدُّنْيَا كَاسِفَةُ النُّورِ، ظَاهِرَةُ الْغُرُورِ؛
عَلَى حِينِ اصْفِرَارٍ مِنْ وَرَقِهَا، وَإِيَاسٍ مِنْ ثَمَرِهَا، وَاغْوِرَارٍ
مِنْ مَائِهَا، قَدْ دَرَسَتْ مَنَارُ الْهُدَى، وَظَهَرَتْ أَعْلَامُ
الرَّدَى، فَهِيَ مُتَجَهِّمَةٌ لِأَهْلِهَا، عَابِسَةٌ فِي وَجْهِ طَالِبِهَا،
ثَمَرُهَا الْفِتْنَةُ، وَطَعَامُهَا الْجِيفَةُ، وَشِعَارُهَا الْخَوْفُ، وَ
دِثَارُهَا السَّيْفُ۔ (ص: ۱۲۱-۱۲۲)

اللہ تعالیٰ نے آپ کو زمانۂ فترت (دو نبیوں کی بعثت کے درمیانی وقفے) میں مبعوث فرمایا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد انبیاء کی پے بہ پے آمد کا سلسلہ مشیتِ ایزدی سے رُک گیا اور حضور خاتم الرسل جناب عیسیٰ کے تقریباً پانچ سو سال بعد تشریف لائے، جس کی وجہ سے انبیائے سلف کی اُمتیں مدتوں خوابِ غفلت میں رہیں (اور) ان پر طاری طولانی جمود نے انھیں بے عمل اور گمراہ بنا دیا (اس محرومِ ہدایت) دور میں فتنے جا بجا سرکش گھوڑوں کی طرح سر اٹھا رہے تھے، امورِ زیست کا شیرازہ بالکل منتشر ہو چکا تھا، ہر جگہ آتشِ جنگ مشتعل تھی، دنیا تیرہ و تاریک

تھی لیکن اس کا دجل و فریب خوب روشن تھا۔ نخلِ انسانیت خزاں دیدہ تھا اس کے پتے زرد ہو چکے تھے اور اس کے بارور ہونے کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی تھی کیونکہ اس کو سیراب کرنے والا آبِ تہذیب اس کی خشک جڑوں سے کہیں نیچے گہرائیوں میں اُتر گیا ہوا تھا۔ ہدایت کے تمام مینار منہدم ہو چکے تھے اور ہلاکت کے پرچم فضائے زمین میں وحشیانہ انداز میں لہرا رہے تھے۔ زمین اپنے باسیوں سے متنفر ہو چکی تھی اور اس کی جبین اپنے عشاق پر شکن آلود تھی۔ ان کے لیے اس کے پاس روحانی غذا فتنہ و تباہ کاری تھی اور جسمانی غذا صرف مردار۔ ان کے دل ناگہانی حوادث سے خوف زدہ اور ان کے جسم پیہم دشمن سے شمشیر بند (اور زرہ پوش) تھے۔

بَعَثَهُ وَالنَّاسُ ضُلَّالٌ فِي حَيْرَةٍ، وَحَاطِبُونَ فِي فِتْنَةٍ، قَدِ اسْتَهْوَتْهُمُ الْأَهْوَاءُ، وَاسْتَزَلَّتْهُمُ الْكِبْرِيَاءُ، وَاسْتَخَفَّتْهُمُ الْجَاهِلِيَّةُ الْجَهْلَاءُ، حَيَارَى فِي زَلْزَالٍ مِنَ الْأَمْرِ، وَبَلَاءٍ مِنَ الْجَهْلِ، فَبَالَغَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ فِي النَّصِيحَةِ، وَمَضَى عَلَى الطَّرِيقَةِ، وَدَعَا إِلَى الْحِكْمَةِ، وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ① حَتَّى أَرَاهُمْ مَنْجَاتَهُمْ وَبَوَّأَهُمْ مَحَلَّتَهُمْ، فَاسْتَدَارَتْ رَحَاهُمْ، وَاسْتَقَامَتْ قَنَاتُهُمْ②

[۱- ص ۱۳۴: ۲- ص: ۱۵۰]

اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسے وقت میں مبعوث فرمایا جب انسان حیرت و پریشانی کے عالم میں راہِ راست سے بھٹک چکا تھا اور اس کا کام محض آتشِ فتنہ و فساد کو مزید اشتعال دینے کے لیے ہیزمِ اسباب کی فراہمی تھا۔ نفسانی خواہشات اور شہوانی آرزوؤں کا وہ غلام ہو چکا تھا۔ غرور اور تکبر نے اسے جادۂ اعتدال و توازن سے دور اُٹھا پھینکا تھا۔ اندھی جہالت نے اس کی عقل کھو دی تھی اور امورِ زندگی کے تزلزل اور عدم استقامت کی وجہ سے وہ نادانی اور تذبذب کے شدید اضطراب میں مبتلا تھا۔ آپ نے اس کی مسخ شدہ ذہنیت و سیرت کے سدھارنے اور سنوارنے کی سعیِ بلیغ و کامیاب فرمائی۔ خود رشد و ہدایت پر ثابت قدم رہے اور گم کردہ راہ انسان کو حکمت

ودانائی اور خوش اخلاقی و نیک خوئی کی نصیحت فرماتے رہے۔

حتیٰ کہ آخر کار آپ نے انسانوں پر راہ نجات روشن کر اور انھیں سعادت کی منزلِ مقصود تک پہنچا دیا۔ چنانچہ ان کی زندگی کی چکّی باقاعدہ گھومنے لگی اور ان کے مقدّر کے نیزے کے بل جاتے رہے۔

أَرْسَلَهُ بِوُجُوبِ الْحُجَجِ، وَظُهُورِ الْفَلَجِ، وَإِيضَاحِ الْمَنْهَجِ، فَبَلَّغَ الرِّسَالَةَ صَادِعاً بِهَا، وَحَمَلَ عَلَى الْمَحَجَّةِ دَالّاً عَلَيْهَا، وَأَقَامَ أَعْلَامَ الِاهْتِدَاءِ وَمَنَارَ الضِّيَاءِ، وَجَعَلَ أَمْرَاسَ الْإِسْلَامِ مَتِينَةً، وَعُرَا الْإِيمَانِ وَثِيقَةً۔ (ص: ۲۷۰)

اللہ تعالیٰ نے آپ کو انسانوں کی ہدایت کے لیے ایسی روشن دلیلوں کے ساتھ مبعوث فرمایا جنھیں قبول کرنا ہدایت یابی کے لیے شرطِ واجب قرار دیا گیا تاکہ الٰہی تدابیر کامیاب ہوں اور ایمان کی راہیں روشن ہوں۔ پس آپ نے اپنی رسالت کے برملا اعلان سے حق و باطل میں امتیاز فرمایا اور صراطِ مستقیم کی طرف انسانوں کی راہنمائی فرمائی اور اسلام کی رسی کو مضبوط اور ایمان کے بندھنوں کو استحکام بخشا۔

اِبْتَعَثَهُ بِالنُّورِ الْمُضِيءِ، وَالْبُرْهَانِ الْجَلِيِّ، وَالْمِنْهَاجِ الْبَادِي، وَالْكِتَابِ الْهَادِي ... لِيُخْرِجَ عِبَادَهُ مِنْ عِبَادَةِ الْأَوْثَانِ إِلَى عِبَادَتِهِ، وَمِنْ طَاعَةِ الشَّيْطَانِ إِلَى طَاعَتِهِ، بِقُرْآنٍ قَدْ بَيَّنَهُ وَأَحْكَمَهُ لِيَعْلَمَ الْعِبَادُ رَبَّهُمْ إِذْ جَهِلُوهُ، وَلِيُقِرُّوا بِهِ بَعْدَ إِذْ جَحَدُوهُ وَلِيُثْبِتُوهُ بَعْدَ إِذْ أَنْكَرُوهُ، فَتَجَلَّى لَهُمْ سُبْحَانَهُ فِي كِتَابِهِ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَكُونُوا رَأَوْهُ بِمَا أَرَاهُمْ مِنْ قُدْرَتِهِ،

وَحَذَّرَهُمْ مِنْ سَطَوَاتِهِ، وَكَيْفَ مَحَقَ مَنْ مَحَقَ بِالْمَثُلَاتِ وَ
اِخْتَصَدَ مَنِ اخْتَصَدَ بِالنَّقِمَاتِ! (۱۔ص۲۲۹ ؛ ۲۔ص۳۰۳)

اللہ تعالیٰ نے آپ کو نور درخشاں، دلیل تاباں، واضح و روشن راہ شریعت اور راہنما کتاب کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ تاکہ وہ اللہ کے بندوں کو کلام پاک کے واضح و محکم تعلیمات کی روشنی میں بت پرستی کی شقاوت سے نجات دلا کر خدائے واحد کی پرستش کی سعادت سے ہمکنار فرما دیں اور شیطان کی اطاعت سے نکال کر انہیں خالق کائنات کی اطاعت میں داخل کریں تاکہ بندگان خدا جہالت سے خلاصی پائیں اور ذات معبود حقیقی کا علم و ادراک حاصل کریں، اس مسلسل کفر کے بعد اس پر ایمان لانے کی سعادت پائیں اور اس کے طویل انکار کے بعد اس کے رب الارباب ہونے کا اقرار کریں۔ اللہ تعالیٰ نے غیر مرئی ہونے کے باوجود اپنی ذات کو اپنے کلام مقدس میں پیش فرمودہ نشانیوں کے ذریعے سے انسان کے سامنے جلوہ گر فرمایا ہے اور اتمام حجت کے باوجود ایمان لانے والے فاسقوں اور ظالموں کو متعدد بار اپنی سطوت و شوکت اور اپنے عذاب شدید کی ہولناکیوں سے "فارسلنا علیہم رجزاً من السماء بما کانوا یظلمون" (پس ہم نے ظالموں کو آسمانی عذاب کا نشانہ بنایا) جیسے الفاظ سے خوف دلایا ہے کہ کس طرح اس نے اپنے دشمنوں کو صفحۂ ہستی سے نابود کیا اور اپنے قہر و غضب کی آتش بار بجلیوں سے ان کے خرمن وجود کو خاکستر کیا۔

أَنْزَلَ عَلَيْهِ الْكِتَابَ نُوراً لَا تُطْفَأُ مَصَابِيحُهُ، وَسِرَاجاً لَا يَخْبُو
تَوَقُّدُهُ، وَبَحْراً لَا يُدْرَكُ قَعْرُهُ، وَمِنْهَاجاً لَا يُضِلُّ نَهْجُهُ،
وَشُعَاعاً لَا يُظْلِمُ ضَوْؤُهُ، وَفُرْقَاناً لَا يُخْمَدُ بُرْهَانُهُ، وَتِبْيَاناً
لَا تُهْدَمُ أَرْكَانُهُ، وَشِفَاءً لَا تُخْشَى أَسْقَامُهُ، وَعِزّاً لَا تُهْزَمُ
أَنْصَارُهُ، وَحَقّاً لَا تُخْذَلُ أَعْوَانُهُ. (ص: ۳۱۵)

فَهُوَ مَعْدِنُ الْإِيمَانِ وَبُحْبُوحَتُهُ، وَيَنَابِيعُ الْعِلْمِ وَبُحُورُهُ،

وَرِيَاضُ الْعَدْلِ وَغُدْرَانُهُ، وَأَثَافِي الْإِسْلَامِ وَبُنْيَانُهُ، وَأَوْدِيَةُ الْحَقِّ وَغِيطَانُهُ. وَبَحْرٌ لَا يَنْزِفُهُ الْمُسْتَنْزِفُونَ، وَعُيُونٌ لَا يُنْضِبُهَا الْمَاتِحُونَ، وَمَنَاهِلُ لَا يَغِيضُهَا الْوَارِدُونَ، وَمَنَازِلُ لَا يَضِلُّ نَهْجَهَا الْمُسَافِرُونَ، وَأَعْلَامٌ لَا يَعْمَى عَنْهَا السَّائِرُونَ، وَآكَامٌ لَا يَجُوزُ عَنْهَا الْقَاصِدُونَ۔ (ص: ۳۱۵)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر نازل شدہ کتاب ایک نورِ مجسم ہے جس کی ہدایت کی قندیلیں گل نہیں ہوتیں، ایک نورانی چراغ ہے جس کی لو خاموش نہیں ہوتی، ایسا سمندر ہے جس کی تھاہ ناپید ہے، ایسا سیدھا راستہ ہے جس کا اختیار کر لینا ہر قسم کی گمراہی سے حفاظت کی ضمانت ہے اور ایسی شعاع ہے جس کے نور پر تاریکی کا کوئی اثر نہیں۔ یہ کتاب حق کو باطل سے ممتاز کرنے والا فرقان ہے جس کی دلیل کی روشنی ماند نہیں ہوتی، ایسی وضاحت کی حامل ہے جس کی قوت مضمحل نہیں ہوتی، جس میں ایسی اکسیر ہے جو شفا ہی شفا ہے اور جس کی موجودگی میں بیماری کا کھٹکا نہیں، ایسی بارگاہ مجد و عزت ہے جس کے انصار و محافظین شکست ناآشنا ہیں اور ایسی حقیقت ہے جس کے حامی مغلوب نہیں ہوتے۔

وہ ایمان کی کان اور اس کا مرکز ہے، علوم کا سرچشمہ اور معارف کا بحرِ ناپیدا کنار ہے، عدل کی جنت ہے جس میں داد گستری کے چشمے ابل رہے ہیں، اسلام کی پایہ گاہ اور اس کی اساس ہے، حق کی وادی اور اس کا وسیع دامن ہے، ایسا بحرِ بیکراں ہے جس کے تموج و تلاطم کو پانی لینے والوں کی کثرت متاثر نہیں کر سکتی، ایسی چشمہ گاہ ہے جس کے فیضانِ آب کو سقاؤں کا ازدحام گھٹا نہیں سکتا۔ ایسا وسیع و عریض گھاٹ ہے جس کے پانی کو ہجومِ تشنگاں کم نہیں کر سکتا، ایسی واضح منزل ہے جس کا مسافر بھٹک نہیں سکتا۔ وصول الی اللہ کے لیے ایک ایسا روشن نشان ہے جو رہرو راہ حقیقت کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا اور ایسا بلند و مرتفع آستانہ ہے جو طالبِ حق کی منزل مقصود ہے۔

جَعَلَهُ اللهُ رِيًّا لِعَطَشِ الْعُلَمَاءِ، وَرَبِيعًا لِقُلُوبِ الْفُقَهَاءِ، وَمَحَاجَّ لِطُرُقِ الصُّلَحَاءِ، وَدَوَاءً لَيْسَ بَعْدَهُ دَاءٌ، وَنُورًا لَيْسَ مَعَهُ ظُلْمَةٌ، وَحَبْلًا وَثِيقًا عُرْوَتُهُ، وَمَعْقِلًا مَنِيعًا ذِرْوَتُهُ، وَعِزًّا لِمَنْ تَوَلَّاهُ، وَسِلْمًا لِمَنْ دَخَلَهُ، وَهُدًى لِمَنِ ائْتَمَّ بِهِ، وَعُذْرًا لِمَنِ انْتَحَلَهُ، وَبُرْهَانًا لِمَنْ تَكَلَّمَ بِهِ، شَاهِدًا لِمَنْ خَاصَمَ بِهِ، وَفَلْجًا لِمَنْ حَاجَّ بِهِ، وَحَامِلًا لِمَنْ حَمَلَهُ، وَمَطِيَّةً لِمَنْ أَعْمَلَهُ، وَآيَةً لِمَنْ تَوَسَّمَ، وَجُنَّةً لِمَنِ اسْتَلْأَمَ، وَعِلْمًا لِمَنْ وَعَى، وَحَدِيثًا لِمَنْ رَوَى، وَحُكْمًا لِمَنْ قَضَى۔ (ص: ۳۱۵ - ۳۱۶)

اللہ تعالیٰ نے اسے علماء کی تشنگی کے لیے سیرابی، فقہاء کے دل کے لیے بہار اور صالحین کے لیے شاہراہ سلوک قرار دیا ہے۔ یہ ایسی دوا ہے جس کے میسر آجانے کے بعد کوئی مرض باقی نہیں رہتا، ایسا نور ہے جس میں تاریکی کا گزر نہیں، ایسی رسی ہے جس کے بل محکم اور دستگیرہ محفوظ ہے، ایسی پناہ گاہ ہے جو بلند وبالا اور ناقابل تسخیر ہے، وہ باعث عزت ہے اس کے لیے جو اس سے تمسک کرے، ضمانتِ امن وسلامتی ہے اس کے لیے جو اس کی حدود میں داخل ہو جائے، ہدایت ہے اس کے لیے جو اس کا اتباع کرے۔ عذر خواہ ہے اس کی لغزشوں کے لیے جو اس سے نسبت قائم کرے۔ حجت ہے اس کے لیے جس کے کلام میں یہ رچا بسا ہوا ہو، گواہ ہے اس کیلئے جو اس کے مسلّمات کی بنیاد پر جدالِ احسن کرے، پیامِ فتح ونصرت ہے اس کے لیے جو اس سے حجت پکڑے۔ حفاظت ہے اس کے لیے جو اس کو حفظ کرے، مرکب خوش رفتار ہے اُس کے لیے جو اس کو اپنا دستور العمل بنائے۔ نشانِ ایزدی ہے اس کے لیے جو معرفت کا جُویا ہو، سپر ہے اس کے لیے جو مبارزۂ باطل کے لیے اسلحہ بند ہو، علم و نور ہے اس کے لیے جو اس کی رُو سے بات کرے۔ فتویٰ قضا ہے اس کے لیے جو مسندِ قضا پر بیٹھے۔

فَهُوَ إِمَامُ مَنِ اتَّقَىٰ، وَبَصِيرَةُ مَنِ اهْتَدَىٰ، سِرَاجٌ لَمَعَ ضَوْؤُهُ،
وَشِهَابٌ سَطَعَ نُورُهُ، وَزَنْدٌ بَرَقَ لَمْعُهُ، سِيرَتُهُ الْقَصْدُ
وَسُنَّتُهُ الرُّشْدُ، وَكَلَامُهُ الْفَصْلُ، وَحُكْمُهُ الْعَدْلُ (ص: ۱۳۹)
جَعَلَهُ اللهُ بَلَاغاً لِرِسَالَتِهِ، وَكَرَامَةً لِأُمَّتِهِ، وَرَبِيعاً لِأَهْلِ
زَمَانِهِ، وَرِفْعَةً لِأَعْوَانِهِ، وَشَرَفاً لِأَنْصَارِهِ (ص: ۳۱۵)

وہ پرہیزگاروں کے امام اور ہدایت یافتگاں کے لیے نورِ بصیرت ہیں۔ وہ ایسا نورانی چراغ ہیں جس کی لو ابدی طور پر زندہ و تابندہ ہے، ایسا روشن ستارہ ہیں جس سے مسلسل نورِ ہدایت کی شعاعیں پھوٹتی ہیں اور ایسی قوی چقماق کی مانند ہیں جس کا جھماکہ برقِ آسمانی کی طرح ماحول کو روشن کرنے والا ہوتا ہے۔ ان کی سیرت اعتدال و میانہ روی، ان کی سنت رشد و صواب، ان کا کلام قطعی اور فیصلہ کن اور ان کا فیصلہ مبنی بر عدلِ الٰہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تبلیغِ وحی کا فریضہ سپرد کرکے آپ کی امت کی عزت افزائی فرمائی اور آپ کے وجودِ ذی جود کو اہلِ عالم کیلیے باعثِ راحت و رحمت، رفقاء کے لیے وجہِ سربلندی اور جاں نثاروں کے لیے سببِ عزت و شرف بنایا۔

اَللّٰهُمَّ دَاحِيَ الْمَدْحُوَّاتِ، وَدَاعِمَ الْمَسْمُوكَاتِ، وَ
جَابِلَ الْقُلُوبِ عَلَىٰ فِطْرَتِهَا، شَقِيِّهَا وَسَعِيدِهَا اجْعَلْ
شَرَائِفَ صَلَوَاتِكَ، وَنَوَامِيَ بَرَكَاتِكَ، عَلَىٰ مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ
وَرَسُولِكَ الْخَاتِمِ لِمَا سَبَقَ، وَالْفَاتِحِ لِمَا انْغَلَقَ، وَالْمُعْلِنِ
الْحَقَّ بِالْحَقِّ، وَالدَّافِعِ جَيْشَاتِ الْأَبَاطِيلِ، وَالدَّامِغِ صَوْلَاتِ
الْأَضَالِيلِ، كَمَا حُمِّلَ فَاضْطَلَعَ، قَائِماً بِأَمْرِكَ، مُسْتَوْفِزاً فِي
مَرْضَاتِكَ، غَيْرَ نَاكِلٍ عَنْ قُدُمٍ، وَلَا وَاهٍ فِي عَزْمٍ، وَاعِياً
لِوَحْيِكَ، حَافِظاً لِعَهْدِكَ، مَاضِياً عَلَىٰ نَفَاذِ أَمْرِكَ؛ حَتَّىٰ

أَوْرَى قَبَسَ الْقَابِسِ، وَأَضَاءَ الطَّرِيقَ لِلْخَابِطِ، وَهُدِيَتْ بِهِ الْقُلُوبُ بَعْدَ خَوْضَاتِ الْفِتَنِ وَالْآثَامِ، وَأَقَامَ بِمُوضِحَاتِ الْأَعْلَامِ، وَنَيِّرَاتِ الْأَحْكَامِ، فَهُوَ أَمِينُكَ الْمَأْمُونُ، وَخَازِنُ عِلْمِكَ الْمَخْزُونِ، وَشَهِيدُكَ يَوْمَ الدِّينِ، وَبَعِيثُكَ بِالْحَقِّ، وَرَسُولُكَ إِلَى الْخَلْقِ۔ (ص: ۱۰۰)

اے اللہ! اے زمینوں کے فرش کو بچھانے والے، بلند آسمانوں (کے شامیانے) کو (بلا عمود و ستون) برپا کرنے والے، دلوں کو اپنی اپنی سعید یا شقی فطرت پر پیدا کرنے والے، شریف ترین (درود و سلام) اور افزوں ترین برکات اپنے برگزیدہ بندے اور اپنے محبوب رسول پر نازل فرما جو پہلی نبوتوں کے خاتم (مدتوں سے مقفل (اور مہر زدہ) دلوں کو (قبول ہدایت کے لیے) کھولنے والے ہیں حق کے بول کو حق (عقل و برہان کی قوت) سے بالا کرنے والے، باطل کے جوش و خروش کو ٹھنڈا کرنے والے اور گمراہیوں اور ضلالتوں کی قوت و سطوت کو پاش پاش کرنے والے ہیں (درود و سلام بے حد و حساب ہوں ان پر کہ) انھوں نے بارِ گراں (رسالت) کو اپنے دوشِ مبارک پر اٹھایا (اور رسالتِ خداوندی کی عظیم ذمہ داریوں سے بطریق) احسن عہدہ برا ہوئے (تیرے امر و فرمان پر مضبوطی سے قائم ہے۔ وہ تیری رضا اور خوشنودی کے حصول میں سریع العمل تھے۔ تیری راہ میں آگے بڑھنے سے کبھی گریزاں اور مذبذب نہیں تھے اور نہ ہی ان کے عزم میں کبھی کسی ضعف کو راہ ملی۔ وہ تیری وحی کے حافظ و محافظ اور تیرے عہد پر سختی سے قائم تھے، وہ تیرے امرِ عظیم کے نفاذ کے لیے پوری طرح کوشاں رہے۔ حتیٰ کہ انھوں نے طالبینِ حق کے لیے نورِ ہدایت کو فروزاں کیا اور گمراہیوں کے اندھیروں میں ٹامک ٹوئیے مارنے والوں کے لیے راہِ ہدایت کو روشن کر دیا۔ چنانچہ فتنہ و گناہ میں غرق دلوں نے آپ کے سبب سے ہدایت پائی۔ آپ نے راہِ ہدایت میں منارہ ہائے نور نصب کیے اور شریعت کے نورانی احکام نافذ کیے۔ وہ تیری وحی کے معتمد امین اور تیرے مخفی علوم کے خزانہ دار تھے اور روزِ قیامت

تیری داوری اور الوہیتِ مطلقہ کے گواہ ہوں گے، وہ تیرے پیغمبرِ برحق اور خلق کی طرف تیرے فرستادہ رسول تھے۔

اَللّٰهُمَّ افْسَحْ لَهُ مَفْسَحاً فِي ظِلِّكَ، وَاجْزِهِ مُضَاعَفَاتِ الْخَيْرِ مِنْ فَضْلِكَ. اَللّٰهُمَّ وَأَعْلِ عَلَى بِنَاءِ الْبَانِينَ بِنَاءَهُ، وَأَكْرِمْ لَدَيْكَ مَنْزِلَتَهُ، وَأَتْمِمْ لَهُ نُورَهُ، وَاجْزِهِ مِنِ ابْتِعَاثِكَ لَهُ مَقْبُولَ الشَّهَادَةِ، مَرْضِيَّ الْمَقَالَةِ، ذَا مَنْطِقٍ عَدْلٍ، وَخُطْبَةٍ فَصْلٍ. اَللّٰهُمَّ اجْمَعْ بَيْنَنَا فِي بَرْدِ الْعَيْشِ وَقَرَارِ النِّعْمَةِ، وَمُنَى الشَّهَوَاتِ، وَأَهْوَاءِ اللَّذَّاتِ، وَرَخَاءِ الدَّعَةِ، وَمُنْتَهَى الطُّمَأْنِينَةِ. وَتُحَفِ الْكَرَامَةِ، وَاحْشُرْنَا فِي زُمْرَتِهِ غَيْرَ خَزَايَا، وَلَا نَادِمِينَ، وَلَا نَاكِبِينَ، وَلَا نَاكِثِينَ، وَلَا ضَالِّينَ، وَلَا مُضِلِّينَ، وَلَا مَفْتُونِينَ (۱۔ ص: ۲۲۲ ۔ ص: ۱۵۴)

اے اللہ آپ کو اپنے سایہ رحمت و احسان میں وسیع و کشادہ مقام عطا فرما، ان کے درجاتِ عالیہ کو مزید بلند فرما، اور (تبلیغِ رسالت کی راہ میں جو رنج و تعب آپ نے برداشت فرمائے ان کی پاداش میں) آپ کو اپنے فضل و کرم سے اجرِ عظیم اور حسناتِ فراواں عطا فرما اور آپ کی برپا فرمودہ عمارتِ شریعت کو جملہ انبیاء کی بنا فرمودہ عمارات پر فوقیت و بلندی و برتری عطا فرما۔ ان کے علوئے مراتب میں اضافہ فرما، ان کے نور کو فروغِ کامل عطا فرما، اور ان کو رسالت کا بہترین اجر عطا فرما کہ تیری ذات کے بارے میں ان کی شہادت مقبول و کامیاب ہوئی اور ان کے فرمودات کو دل و جان سے پسند کیا گیا جو سراسر مبنی بر عدل اور حق و باطل میں حدِ فاصل تھے۔ اے اللہ روزِ محشر ہمیں آپ کے سایہ رحمت میں خوشگوار زندگی عطا فرما اور منزلِ نعمات جاودانی میں جگہ دے جہاں ہر قسم کی پاکیزہ خواہشات

حاصل اور روحانی لذات میسر ہیں اور آسائش، فارغ البالی اور سکون و اطمینان کی فراوانی ہے اور شرف و کرامت کے تحفے عام ہیں ہمیں آپ کی جماعت میں اس طرح محشور فرما کہ ہم ذلیل و رسوا نہ ہوں، نہ حق سے منحرف اور پیمان شکن ہوں اور نہ فریب خوردہ و فتنہ زدہ۔

باب العلم کی سالانہ رکنیت سازی

اُردو میں پہلی بار امیر المومنین حضرت امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے باب میں علمی، فکری اور تحقیقی جریدی سلسلے "باب العلم" کا اجرا کیا جا رہا ہے جس میں تمام زبانوں اور تمام زمانوں کی نادر و نایاب تحریروں کا انتخاب، عصری تقاضوں سے ہم آہنگ مقالے اور مذاکرے شامل ہوں گے۔

افراط و تفریط اور انحرافات کے اس گرد و غبار میں امیر المومنین حضرت امام علیؑ کی معجز نما رہبری دُنیائے اسلام میں اُبھرتی ہوئی احیائے فکر دینی کی تحریک کو جلا بخش سکتی ہے۔

آج پہلے سے کہیں زیادہ امیر المومنینؑ کے کردار اور عمل سے نورِ علم و آگہی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

"باب العلم" سال میں پانچ بار پیش کیا جائے گا۔ جس کا سالانہ زرِ اعانت سو روپے ہے۔ آپ کا تعاون "باب العلم" کے استحکام کے لئے ازحد ضروری ہے۔

ہم اللہ سبحانہٗ تعالیٰ سے آپ کی توفیقات میں اضافے کے لئے دُعاگو ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

جنابِ شیخ محمد عبدہ کا

مفتیٔ اعظم مصر

مقدمۂ نہج البلاغہ

بعد حمد و نعت ۔ قضا و قدر کے فیصلہ کے مطابق مجھے اتفاقاً بلا ارادہ کتاب نہج البلاغہ کے دیکھنے کا موقع ملا ۔ مجھے یہ کتاب اس وقت ملی جب میں پریشان حال تھا، دل کو اطمینان نہ تھا، ذہنی مشغولیتیں بہت تھیں، مگر کام کوئی نہ تھا۔ اس لئے میں نے اسے مونس تسلی و تنہائی سمجھ کر بعض صفحات پڑھے، مختلف مقامات اور متفرق موضوعات کے تھوڑے جملوں پر غور کیا، تو مجھے ہر مقام پر ایسا معلوم ہونے لگا ۔ جیسے لڑائیاں ہو رہی ہیں، حملے کئے جا رہے ہیں ۔ ساتھ ہی معلوم ہوتا ہے کہ بلاغت کی حکومت ہے، فصاحت کا اقتدار قائم ہے، نیز اوہام سرکشیاں کر رہے ہیں اور شکوک کج خلقی پر آمادہ ہیں، جن کے ساتھ خطابت کے لشکر اور زور بیان و بلاغت کے دستے نظم کی لڑیوں اور انتظام کی صفوں میں منسلک ہو کر برق وش تلواروں اور گندمی نیزوں کے ساتھ شدید ضرب و پیکار میں مصروف ہیں اور دلائل کے لبوں سے دلوں کو چوس رہے ہیں، جس کے باعث وسوسوں کی شیطنت ختم [illegible] ہوتی جا رہی ہے اور اوہام کے لشکر فنا ہوتے جا رہے ہیں، اور پھر میں ذرا ہی دیر میں دیکھتا کیا ہوں کہ حق کو فتح نصیب ہو چکی ہے اور باطل شکست کھا چکا ہے، اور وہم کا فتنہ ختم ہو گیا ہے ۔ اور اس حکومت کا مدبر اور اس غلبہ و اقتدار کا مرد میدان امیر المومنین علی ابن ابی طالب ہیں، جن کے دست مبارک میں پرچم حکومت تھا!

یہ کتاب جلیل وہ مجموعہ ہے جسے سید شریف رضی رحمۃ اللہ نے سیدنا مولانا حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے کلام مبارک سے منتخب کیا ہے، اس کلام کے بکھرے ہوئے حصوں کو جمع کیا اور اس کو "نہج البلاغہ" کا نام دیا، اور میرے علم میں اس نام سے بہتر اس کتاب کی حقیقت کو ظاہر کرنے والا کوئی دوسرا نام ہو بھی نہیں سکتا ہے میرے لئے یہ بھی ناممکن ہے کہ میں اس کتاب کے نام سے بہتر اس کے وصف و تعریف کے لئے کوئی دوسرا نام لاؤں۔

اور اگر پیدائشی خصوصیات اور فرائض کا احساس ہم پر اعتراف جلیل اور محسن کے احسانات کی شکر گزاری فرض نہ ہوتی، تو ہم کو یہ بھی بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ نہج البلاغہ میں کیا کیا فنون، فصاحت اور بلاغت کے کیسے کیسے نکتے موجود ہیں جبکہ اس نے کلام کے کسی شعبہ کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے، اور عقل کے لئے قبول کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رکھا ہے۔ مگر عبارت کتاب میں بُعد زمانہ، نیز ہمارے زمانے لوگوں کے اہل زبان سے بے تعلق ہو جانے کی وجہ سے کہیں کہیں غیر معروف الفاظ بھی اپنی خوبیوں کے ساتھ، اور بلیغ جملے تعقید کے بغیر نظر آجاتے ہیں جس کی وجہ سے مطالعہ کرنے والے کی فہم بعض مفردات یا مضمون کے بعض مفہومات کے سمجھنے سے قاصر رہتی ہے، مگر یہ دقت لفظ یا معنی میں کسی ضعف یا کمزوری کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتی، بلکہ اس کا سبب خود پڑھنے والے کے ذہن و عقل کی کمزوری ہوتی ہے۔

اور اسی چیز کو دیکھ کر مجھے یہ خواہش ہوئی کہ میں مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان مشکلات کو بھی حل کرتا جاؤں، اور دیکھنے کے ساتھ اس کی توضیح بھی کرتا چلوں، اور اس کے مشکل لغات کو حل کردوں اور بعض جملوں کی شرح کردوں اور اس کے کچھ اشارات کو بھی متعین کردوں، اور پھر یہ سب چیزیں بقدر ضرورت ہی ہوں اور توضیح و تشریح بھی حتی الامکان مختصر ہی ہو اور ان توضیحات میں لغات کی مشہور کتابوں پر اعتماد کروں اور صحیح روایات ہی کو درج کروں، ساتھ ہی ساتھ میں نے امام علیہ السلام کے مسئلہ امامت سے متعلق جو روایتیں اس میں درج ہیں، ان کے جرح و تعدیل سے کوئی واسطہ نہیں رکھا ہے

بلکہ میں جتنا ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچتا، مجھے مناظر بدلتے ہوئے اور آثار متغیر ہوتے ہوئے دکھائی دیتے تھے، چنانچہ کبھی میں اپنے کو ایسے عالم میں پاتا جس میں اچھی عبارتوں کے جلوں میں معانی کی بلند ترین روحیں آباد ہو رہی ہوتی تھیں اور وہ اچھے معانی اور پاکیزہ نفوس کے گرد طواف کرکے اور صاف قلوب سے قریب ہوکر اصلاح کا پیام دیتے، مقصد کو پائیدار کرتے اور قلوب کو لغزشوں کے غار میں گرنے سے بچا کر فضل و کمال کے راستوں پر ڈال دیتے!

اور کبھی اس (کتاب نہج البلاغہ) کے جملے ایسی خرام طبع ہستیاں نظر آتیں جن کے دانت نمایاں ہوتے اور جس کی روح چیتوں کی شکل میں اور شاہین کا پنجہ بن کر اپنے شکار پر حملہ کرنے کے لئے تیار نظر آتی، پھر وہ اپنے شکار پر ٹوٹ پڑتی اور قلوب سے خواہشات چھین لیتی اور طبائع کی ہوس اچک لیتی، اور غلط خواہشات اور باطل خیالات کو چھین کر اپنے قبضہ میں کر لیتی!

اور کبھی میں یہ دیکھتا کہ ایک عقلِ نورانی جو جسمانی مخلوق سے کوئی مشابہت نہیں رکھتی ہے، خداوندی کے شاہانہ جلوس اور سواری سے الگ ہوکر روحِ انسانی سے مل گئی ہے اور اس پر پڑے ہوئے مادی عنصر کے پردوں کو چاک کرکے اسے ملکوت اعلیٰ کی طرف اٹھا لے گئی ہے، یا مشہدِ نورِ تجلی تک اسے لے کر پہنچ گئی ہے اور فتنوں اور اوہام کے داغ دھبوں سے صاف کرکے، پایۂ عرش کے ایک طرف ٹھہرا دیا ہے۔

اور کبھی میں ایسا محسوس کرتا جیسے ایک حکمت نواز خطیب کی آواز میرے کانوں میں آ رہی ہیں، جو بلند آواز سے کچھ کہہ رہا ہے، اور امت کے ارباب حل و عقد کو ندا دے رہا ہے۔ انہیں درست اور صحیح راستہ بتا رہا ہے، شک کے مقامات بھی دکھا رہا ہے اور قدم پھسل جانے والی جگہوں سے ڈرا رہا ہے، ان کی سیاست کے دقائق اور باریکیوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور عقلمندی کی راہوں پر لگا رہا ہے سرداری کو امارت کے منصب سے فائز کر رہا ہے، اور سیاست و تدبر کی بلندیوں پر چڑھا رہا ہے اور وہ جگہ دکھا رہا ہے، جو انسانی اعمال کے انجام و عاقبت کی جگہ ہے۔

بلکہ مطالعہ کرنے والے کے فیصلہ پر اسے چھوڑ دیا ہے کہ وہ ان مسائل سے متعلق مشہور اخبار و آثار و روایات پر بھروسہ کرے ، یا دوسرے رُخ سے معاملات کو پرکھے ، اس کے باوجود عبارت کی توضیح اور اشارات کے تعین میں بھی کوئی کمی نہیں کی ہے ۔ جس سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ جو کچھ میرے ذہن میں موجود ہے محفوظ ہو جائے اور جو حافظہ میں موجود ہے وہ یاد آجائے تاکہ نسیان اور اعراض و گمراہی سے بچ سکوں ، اور اس کتاب میں مجھے صرف اس چیز سے تعلق رہا ہے کہ اس کے بلند و عالی معانی و کلام و بلاغت کے تمام شعبوں میں کس طرح رفیع و اعلیٰ عبارات و الفاظ کے قالب میں ڈھلے ہوئے ہیں ۔

اکابر علماء کی ایک اچھی خاصی جماعت نے اس کتاب کی شرح سے دلچسپی لی ہے ، اور شرح کی ہے ، اور ان میں سے ہر ایک نے ان اسرار کو ، جو اس کتاب میں موجود ہیں ، بیان کرنے میں مبالغہ و تطویل سے کام لیا ہے ، اور ہر ایک شخص ایک مسلک کی تائید کی کوشش اور ایک مشرب کی تقویت میں مصروف رہا ہے ، مگر مجھے ان کی تمام شرحوں میں یہ چیزیں بکھری ہوئی ، اور ان شارحین کی طرف سے کتاب میں نقل اور درج کی ہوئی نظر آئیں ، اس لئے اگر میں نے ان سے کہیں اتفاق کیا ہے تو یہ اتفاقی امر ہے ، اور اگر کہیں مخالفت کی ہے تو اپنے خیال میں درست سمجھتا ہے ۔

نیز میں اپنی اس فرہنگ کو کوئی شرح یا شرح کے ضمن میں بھی نہیں شمار کرتا ہوں بلکہ یہ نہج البلاغہ کی صرف ایک فرہنگ و تسہیل ہے اور ایک ایسی چیز ہے جس سے نہج البلاغہ کے کناروں کو آراستہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

ساتھ ہی مجھے امید ہے کہ میرا یہ مختصر بیان اس زمانہ کے نوجوانوں کے لئے فائدہ مند ثابت ہوگا ، کیونکہ میں نے ان کو طلب علم کے راستے میں کھڑا ہوا دیکھا ہے کہ وہ زبان عرب کو حاصل کرکے اپنے تک پہنچنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے عربی سلیقہ ڈھونڈتے ہیں ، اور لغوی ملکہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ہر شخص خطیب و مقرر اور منشی و ادیب بننا چاہتا ہے ، لیکن وہ اپنی طلب اور کوشش میں بطور وسیلہ ، مقامات اور کتب و مراسلات کو اپنا رہنما بناتے ہیں جن کو مولدین نے لکھا ہے اور پھر متاخرین نے اس کی تقلید کی ہے جنھوں نے

ان کتابوں کے لکھنے میں سوائے اچھے الفاظ اور صنائع تجنیس و سجع کی مراعات اور اس طرح کے دوسرے لفظی محسنات اور خوبیوں کے اور کوئی خوبی کی بات نہیں پیدا کی ہے، اور اس کا نام فنون بدیعیہ رکھا ہے۔ اگرچہ عبارتیں عظیم و جلیل معانی سے خالی رہیں یا رفیع و اعلیٰ اسالیب بیان سے محروم۔

بہرحال کلام کی اس نوع کو بعض لسان عربی کہہ سکتے ہیں۔ کل نہیں کہہ سکتے، بلکہ اگر یہ ضعف کلام تنہا پیش کی جائے، تو کلام کے ادنیٰ طبقات میں شمار ہوگی۔ اور اواخر الفاظ میں اس کی خوبی اور حسن اسے درمیانی درجہ پر بھی نہیں پہنچا سکتا ہے، اس لئے اگر وہ مذکورہ طریقہ کے بجائے ان چیزوں کے پڑھنے کی طرف مائل ہوتے جو اہل زبان اور خصوصاً اہل زبان کے طبقہ اعلیٰ سے منقول و مروی ہے تو اپنی غرض اور مقصود کو ضرور پا لیتے اور جس چیز کے لئے ان میں تڑپ تھی، اسے حاصل کر لیتے اور ماہرین عرب میں ہر شخص اس کا قائل ہے کہ اللہ اور رسولؐ کے کلام کے بعد علی بن ابی طالب کا کلام اشرف کلام اور بلیغ ترین زبان ہے، اور مواد کے اعتبار سے اس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں ہے، اسلوب کے اعتبار سے بہت بلند ہے اور معانی کے لحاظ سے تو وہ جلیل ترین حقائق کا جامع ہے۔ اس لئے نفائس زبان کو حاصل کرنے کی طلب میں سرگرداں رہنے والے، اور اس کے زینوں پر چڑھنے کی خواہش رکھنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کتاب (نہج البلاغہ) کو اپنا اہم ترین سرمایہ اور بہترین ذخیرہ قرار دیں، اور جس مقصد کیلئے یہ کتاب مدون کی گئی ہے ان معانی کو بھی سمجھنے اور ان پر غور کرنے کی کوشش کریں، اس کے الفاظ میں وہ معانی تلاش کریں، جن کے لئے وہ لفظ استعمال کیا گیا ہے، تاکہ اس طرح وہ اپنے بہترین مقاصد تک پہنچ سکیں۔ اس کے بعد میں اپنے کلام میں اور ان طلبہ کی خواہشات میں اللہ تعالیٰ سے کامیابی کی دعا کرتا ہوں اور اپنی اور ان کی امیدوں کے بر آنے کی دعا کرتا ہوں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جناب سید انوار احمد بلگرامی

کیا یہ حقیقت نہیں؟

سلونی قبل ان تفقدونی! پوچھ لو اس سے پہلے کہ تم مجھے اپنے درمیان نہ پاؤ۔

یا ابوالحسن! بیشک ہم آپ کی یہ صدا، آپؑ کی یہ دعوتِ فکر و نظر، انسان سازی کی ترغیب کی یہ ندا مسلمانوں کے ذہنوں میں شکوک و شبہات اور وسوسوں کے سارے سوراخ بند کر دینے کی للکار، ارتقائے انسانی کی ماورائی منزلیں جو حواسِ خمسہ کی دسترس اور تنگ و دو سے باہر ہیں اور بالا ہیں، ان کی شناخت پیدا کرنے کا یہ چیلنج اور قربتِ الی اللہ کے سفر کے غیب کے مرحلوں سے اجنبیت دور کرنے اور اس راستے پر ہم کو گامزن کرنے کے لئے بلاوے کی یہ آواز آج بھی کانوں میں گونج رہی ہے۔

یا علیؑ! آج اسوۂ رسولؐ زندہ ہے اور اس طرح زندہ ہے کہ نہ صرف ہماری (مسلمانوں کی) بلکہ پوری انسانیت کی سرنوشت اسوۂ رسول کے تحرک. و تدبیر سے اور اس کے طریقۂ کار (METHODOLOGY) سے وابستہ ہے۔

یا علیؑ! آپؑ تو اس کے گواہ ہیں کہ خانۂ کعبہ سے جب آنحضرتؐ مشرکوں کے ایجاد کردہ جبیل عرب کے ہبل ۳۰۰ گونگے، بہرے اور اندھے بتوں کو تاریخ کے کوڑے دان میں پھینکتے جاتے تھے تو ساتھ ہی ساتھ اپنی زبانِ صدق و صفا سے یہ بھی کہتے جاتے تھے: انہ کان زھوقا " باطل کی قسمت میں جانا ہے نابود ہونا

ہے۔ باطل مٹ کے رہے گا۔

یا امیرالمومنینؑ آپ نے خود اپنے وجود کی جہت اور سمت کا اس طرح تعین فرمایا کہ "رسول خدا بجز خدائی رہنمائی اور ہدایت کے کسی کی پیروی نہیں کرتے تھے اور میں بجز آنحضرت کی رہنمائی کے کسی کی پیروی نہیں کرتا تھا۔

یا ابوالحسنؑ آپ نے یہ بھی تو فرمایا تھا "قرآن کے بتدریج نازل ہونے کے زمانے میں کوئی سورہ اور کوئی آیت، جملہ، اصطلاح و الفاظ یا حرف ایسا نہیں ہے جو نازل ہوئے ہوں اور آنحضرت نے مجھے نہ سنائے ہوں اور مجھے نہ لکھوائے ہوں، میں حکم کے بموجب ان کو صحیح جگہ لکھ لیتا تھا۔ آپ مجھے صرف (قرآن کا) متن ہی املا نہیں کروا تے تھے بلکہ ضروری شرح بھی مثلاً ہر آیت اور ہر سورہ کی تاریخ، پس منظر اور اس کے مضمرات بھی لکھواتے علاوہ ازیں آپ نے قرآن کی معنویت کے ہزار ابعاد (DIMENSIONS) اور بنیادی نکات تعلیم فرمائے جن میں ہر بنیادی نکتہ دیگر ہزار معنویتوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے"

یا علیؑ! جس تعلیم و تعلم اور رہبری اور اس کی پیروی کا آپ ذکر کر رہے ہیں یہی تو وہ اسوہ حسنہ ہے جو ہمارے لئے، پوری انسانیت کے لئے مینارہ نور ہے اور ہر زمانے سے زیادہ آج ہمیں اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ آج طاغوت پورے کرۂ ارض کو خانہ کفر بنانے پر تلا ہوا ہے۔

یا علیؑ! کیا آپ نے ہم کو یہ نہیں سمجھایا، یاد کرانے کی کوشش نہیں کی کہ "جو بھی اس قرآن کا ہم نشین ہوا وہ ہدایت کو بڑھا کر اور گمراہی اور ضلالت کو گھٹا کر اس سے الگ ہوا۔ جان لو کہ کسی کو قرآن کے (تعلیمات) کے بعد (کسی اور لائحہ عمل کی) احتیاج نہیں رہتی اور نہ کوئی قرآن سے کچھ سیکھنے سے پہلے اس سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔ یقیناً بندوں کے لئے اللہ کی طرف متوجہ ہونے کا اس جیسا کوئی ذریعہ نہیں۔ قیامت کے دن ایک ندا دینے والا پکار کر کہے گا کہ دیکھو قرآن کی کھیتی بونے والوں کے علاوہ ہر بونے والا اپنی کھیتی اور اپنے اعمال کے نتیجے میں مبتلا ہے تم اپنے پروردگار تک پہنچنے کے لئے راہ بناؤ اور اس کے مقابلے میں اپنی خواہشوں کو غلط و فریب خوردہ سمجھو۔"

کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج ہم مسلمان ایک ایسے ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں کھڑے ہیں کہ جہاں

سوشلزم، نیشنلزم، ہیومنزم، سیکولرزم، کمیونزم، فیشنلزم اور اس قبیل کی ساری انسانی قیاس آرائیاں اور اختراعات ہمہ وقت دستیاب ہیں۔ شدید قسم کے دائیں بازو والے اور شدید قسم کے بائیں بازو والے امریکہ اور روس، مغرب اور مشرق کے بیچ میں ڈبکیاں لے رہے ہیں۔ اپنی حقیقی میراث اور اپنی بے مثال پونجی سے بے خبر بے پرواہ، اپنی کھیتی اور اپنے اعمال کے نتیجہ میں مبتلا ہیں۔

یا ابوالحسنؑ! آپ نے تو ہمارے لئے ایک واضح معیار مقرر کر دیا تھا۔ آپؑ نے مسلمان کو ایسا ذمہ دار انسان بنایا کہ اگر اس کا نفس کسی ناگوار صورت حال کو برداشت کرنے سے انکار کرتا ہے تو وہ اس کی من مانی خواہش کو پورا نہیں کرتا۔ حقیقی مسلمان سے بھلائی ہی کی توقع ہو سکتی ہے۔ اور اس سے گزند کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ کسی کا دشمن بھی ہو اس کے خلاف بے جا زیادتی نہیں کرتا اور جس کا دوست ہوتا ہے اس کی خاطر بھی کوئی گناہ نہیں کرتا، قبل اس کے کہ اس کی کسی بات کے خلاف گواہی کی ضرورت پڑے وہ خود ہی حق کا اعتراف کر لیتا ہے۔ جن سے دوری اختیار کرتا ہے تو وہ زہد و پاکیزگی کے لئے ہوتی ہے۔ اور جن سے قریب ہوتا ہے تو یہ خوش خلقی و رحم کی بنار پر ہے۔ نہ اس کی دوری غرور و کبر کی وجہ سے اور نہ اس کا میل جول کسی فریب اور مکر کی بنار پر ہوتا ہے۔

یا امیرالمومنینؑ۔ آپ نے ہماری ہدایت کے لئے ایک مشہور چہرہ اور بھی ہم لوگوں کو دکھا دیا تھا تاکہ ہم اپنے راستے کو انتخاب کرتے وقت دونوں تصویریں اپنی نگاہوں کے سامنے رکھیں اور اچھے اور برے، مفید اور ضرر رساں کو اچھی طرح پہچان لیں اور نتائج اور انجام کی پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنے حق اختیار رائے دہی کا استعمال۔ آپؑ نے فرمایا "میں تم کو منافقوں سے بھی چوکنا کئے دیتا ہوں کیونکہ وہ گمراہ اور گمراہ کرنے والے، بے راہ اور بے راہ روی پر لگانے والے ہیں۔ وہ مختلف رنگ اور ہر بات میں جداگانہ پینترا بدلتے ہیں اور تمہیں ہم خیال بنانے کے لئے ہر قسم کے مکر و فریب کے ڈنڈوں کا سہارا دیتے ہیں اور ہر گھات کی جگہ تمہاری تاک لگائے بیٹھے ہیں۔ ان کے دل نفاق

کے روگ میں مبتلا اور چہرے (بظاہر کدورتوں سے) پاک و صاف ہیں۔ وہ اندر ہی اندر چالیں چلتے ہیں اور (بہکانے کے لئے) اس طرح رینگتے ہیں بڑھتے ہیں جس طرح مرض چپکے سے سرایت کرتا ہے۔ ان کے طور طریقے دوا، باتیں شفا اور کرتوت درد بے درماں ہیں (دوسروں کی خوشحالی پر جلنے والے) انہیں مصیبتوں میں پھنسانے کے لئے جد و جہد کرنے والے اور انہیں بے آس بنانے والے ہیں ہر رہگذر پر ان کا ایک کشتہ اور ہر دل میں گھر کرنے کا ان کے پاس وسیلہ ہے اور ہر غم کے لئے ان کی آنکھوں میں مگرمچھ کے آنسو ہیں ایک دوسرے کے قرضے کے طور پر مدح و ستائش کرتے ہیں اور اس کا بدلہ دیے جانے کی آس لگائے رکھتے ہیں۔ اگر مانگتے ہیں تو لپٹ ہی جاتے ہیں اور برا بھلا کہنے لگتے ہیں تو رسوا کر کے چھوڑتے ہیں۔ اگر کوئی فیصلہ کرتے ہیں تو بے راہ روی میں حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ انہوں نے ہر حق کے مقابلے میں باطل اور ہر راست کے مقابلے میں کج۔ ہر زندہ کے لئے قاتل۔ ہر در کے لئے کلید اور ہر رات کے لئے چراغ مہیا کر رکھا ہے۔ وہ بے آسی میں آس پیدا کر لیتے ہیں کہ جس سے اپنے بازار جمائیں اور اپنے مال کو رواج دیں۔ غلط بات کو صحیح بات کے انداز میں کہتے ہیں اور باطل کو حق کا رنگ دے کر پیش کرتے ہیں انہوں نے اپنے لئے تو راستے آسان بنا رکھے ہیں اور دوسروں کے لئے پیچیدگیاں ڈال رکھی ہیں۔ وہ شیطان کا گروہ اور آگ کا شعلہ ہیں۔ جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے کہ "اولئک حزب الشیطان الا ان حزب الشیطان ھم الخاسرون" یہ شیطان کا گروہ ہے اور جانے رہو کہ شیطان کا گروہ ہی گھاٹا اٹھانے والا ہے

یا علیؑ! آپ نے حزب اللہ اور حزب الشیطان کی واضح شناخت کرا دی ہے۔ ہم کو شیطانی گروہ کی جس نے اس پورے کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ واضح نشاندہی کر دی اور صاف صاف بتا دیا کہ باطل کو حق کا رنگ دینے والوں سے ہم بھاگیں۔ حق کے علمبرداروں کے طرفدار بنیں حق کے پرچم کو سربلند رکھیں۔ اللہ سے ڈریں۔ اپنے مبدا اور اپنے معاد کو یاد رکھیں۔ اپنی ابتدا کو نظر میں رکھیں اور اپنے انجام پر نظر کریں۔ آپ نے ہم کو بتا دیا کہ "تمہیں تو بس یہی چاہیے کہ تم واضح نشانوں پر چلتے

رہو اور تم سے پہلے لوگوں نے جو کہا ہے۔ اسے دہراتے رہو۔ اللہ تمہاری ضروریات دنیا کا ذمہ لے چکا ہے۔ اور تمہیں صرف شکر گزار رہنے کی ترغیب دی ہے اور تم پر واجب کیا ہے کہ اپنی زبان سے اس کا ذکر کرتے رہو اور تمہیں تقویٰ اور پرہیزگاری کی ہدایت کی ہے اور اسے اپنی رضا و خوشنودی کی حد آخر اور مخلوق سے اپنا مدعا قرار دیا ہے۔ جو اللہ سے ڈرے گا وہ اس کے لئے فتنوں سے بچ کر نکلنے کی راہ نکال دے گا۔ اور اندھیروں سے اجالوں میں لے آئے گا۔ اور حسب دل خواہ نعمتوں میں اسے ہمیشہ رکھے گا۔

(نہج البلاغہ سے اقتباسات اخذ کئے گئے)۔

سید انوار احمد بلگرامی کی فکر انگیز کتابیں:-

۱: بعد از خدا بزرگ ؑ ۲: حسین ؑ وارث انبیاء ؑ ۳: سیل رواں
۴: طاقت پرواز ۵: احساس زیاں ۶: جہان نو
۷: شکست شب (زیر طبع)

انقلاب اسلامی کی بنیادیں

پروفیسر حامد الگار

انگریزی سے ترجمہ:- سید انوار احمد بلگرامی

زیر طبع ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

جناب ناصر مکارم شیرازی

فارسی سے ترجمہ جناب سید صغیر حسین رضوی کامل

نہج البلاغہ کی جاذبیّت کا راز

عرصۂ دراز سے نہج البلاغہ اپنے تمام شکوہ وعظمت والہامی خطبوں و اپنی دور رس فکر اپنے اجتماعی مسائل کی تفصیل اور معرفتِ خداوندی کے اسباق، اپنی ولولہ انگیز تقاریر اور مصیبت زدہ اور کمزور انسانوں کیلئے بے قید وشرط کے بیان کے ساتھ ہمارے درمیان موجود ہے۔ لیکن خاص علماء کے علاوہ اس سے عوام واقفیت نہ رکھتے تھے اور عوام کو صرف یہ معلوم تھا کہ یہ ایک الہام بخش انقلابی کتاب ہے، یہ بڑی تکلیف دہ حقیقت ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس لاعلمی اور بے اعتنائی پر غور کیا جائے اور اس کے علل واسباب معلوم کیے جائیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ آخرکار نہج البلاغہ نے اس بے توجہی اور جہالت کے پردہ کو چاک کیا اور سب سے بڑی بھول کے گرد وغبار کو عقلِ انسانی سے دور کیا۔ آج نہج البلاغہ مثل قرآن مجید کے عام لوگوں کے ہاتھوں میں ہے اور اس نے عوام کا جمود دور کرکے ان میں حرکت پیدا کی اور آتشِ انقلاب کو بھڑکایا اور جوشیلی تقاریر اور پرجوش نظموں، اور انقلابی افکار نے ایک مقام پیدا کیا اور عوام پر علم وآگاہی کا ایک دروازہ کھولا اور انہیں یہ بتادیا کہ وہ سخت مصائب وآلام کے اوقات میں کس قدر کامیابیاں حاصل کر سکتے ہیں۔

بات یہاں تک پہنچی کہ گزشتہ شہنشاہی طاغوتی حکومت نے نہج البلاغہ کو ایک ممنوع الاشاعت کتاب قرار دے دیا اور اُن کا یہ خیال درست تھا اس لئے کہ نہج البلاغہ ان کا ایک ایسا دشمن تھا کہ صلح پر کسی طرح آمادہ ہی نہ ہوتا تھا اور مظلوموں محروموں اور مسلمانوں کا بھی خواہ دوست، اس کے بعد عمومی افکار میں نہج البلاغہ کی معرفت کے لئے ایک لہر پیدا ہوئی اور تمام افراد خاص طور سے نوجوانوں نے پوری تشنگی سے کوششیں کیں کہ اپنے کو نہج البلاغہ تک پہنچائیں اور اس کے خالص سرچشمہ سے سیراب ہوں آج بہت کم گھر ایسے ہیں کہ جن میں نہج البلاغہ موجود نہ ہو اور ہمارے معاشرے میں بہت کم لوگ ایسے ہیں کہ جنہوں نے نہج البلاغہ کی پرکشش تحریر سے اثر نہ لیا ہو۔ ہمارے عقیدہ کے مطابق جو کچھ نہج البلاغہ کو خصوصی امتیاز حاصل ہے اُس سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ یہ انسانوں کے پیشوا کا کلام ہے اس کی حیثیت اور حیرت انگیزی حسب ذیل ہے۔

(۱) یہ انسانی زندگی کے حقیقی مسائل پر روشنی ڈالنے والا ہے۔

اس عظیم المرتبت کتاب کے تینوں حصوں (خطبات، خطوط اور مختصر کلمات) میں انسان کی زندگی کے اصل مسائل بیان ہوئے ہیں۔ تمام مقامات میں انسانیت کے درد و آلام اور سختیوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور اُن کے علاج کے طریقے بھی بتلائے گئے ہیں۔ نہج البلاغہ صرف ایک منطقی اور فلسفیانہ کتاب نہیں ہے بلکہ حضرت علی علیہ السلام ایک مرد عمل اور کامیاب و کامران انسان ہیں وہ صرف باتیں بنانا نہیں جانتے تھے اُن کے کلام میں ہر جگہ اسی مقصد (عملی زندگی) کو سامنے رکھا گیا ہے۔ اگر ہم غور کریں تو ہم پر یہ بات ثابت ہو گی کہ افلاطون اور ارسطو کے فلسفے سے یہ ممکن نہ ہو سکا کہ وہ جمہور انسان کو حرکت میں لائے اور یونان کے فاسد نظام کو سرنگوں کرے دنیا کے دوسرے ممالک کا تو ذکر ہی نہیں، لیکن حضرت علی علیہ السلام کی نہج البلاغہ نے تعلیمات قرآن اور اسوۂ رہبر انسانیت (سرکار دو عالم) کی روشنی میں ایک عالمی انقلاب پیدا کیا اور جمہور کی فضا میں حرکت پیدا کی اسی ایک امر پر نظر کرتے ہوئے یہ بات واضح

ہو جاتی ہے کہ ایک شخص ہمارے سامنے ایسا آتا ہے جس کا عمل بیجا گوئی پر مبنی ہے۔ پہلا بیہودہ انسانی زندگی سے دور ہو جاتا ہے اور دوسرا زندگی کی ہر فصل اور تجربہ پر نظر رکھتا ہے اس کی بات معاشرہ میں حرکت پیدا کرتی ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ پہلا انسان غرور کی پیداوار ہے جو کہ جمہور کے بیچوں بیچ اور باطل نگاہوں میں گرفتار رہتا ہے اور دوسرا تعلیمات آسمانی اور سرچشمۂ وحی کہ جو فطرت کے عین مطابق ہے، کے پرورش یافتہ ہیں۔

(۲) نہج البلاغہ انسانی جانکاہ زخموں کا مرہم اور علاج ہے۔

آپ کو کوئی اور کتاب ایسی مل سکتی ہے؟ کہ جو غم دیدہ و محروم انسانوں کے لئے اس طرح فریاد کرے۔ ایسی فریاد جو انسانوں کے علم میں اضافہ کرے اور مقصدِ حیات حاصل کرنے کے لئے ان میں قوتِ رفتار پیدا کرے۔

مثلاً جب کہ آپ فرمان بنام مالک اشترؒ میں معاشرہ کے گروہوں سے متعلق بات کرتے ہیں تو اندازِ کلام ایک خاص اطمینان اور تنظیم سے آگے بڑھتا ہے۔ لیکن جیسے ہی آپ کی گفتگو محروموں اور بدنصیبوں کے ذکر تک پہنچتی ہے تو آپ کا بیان ایسی بلندی اختیار کر لیتا ہے گویا آپ دل کی گہرائیوں سے فریاد کر رہے ہیں

«الله الله في الطبقة السفلى من الذين لا حيلة لهم
من المساكين والمحتاجين و اهل البؤسى
والزمنى»

خدا کے لئے! خدا کے لئے! اے مالک پسماندہ اور محروم طبقہ میں سے ان لوگوں پر خاص نظر رکھو جو مصیبت زدہ ہوں اور غربت کی وجہ سے کوئی چارۂ کار نہ رکھتے ہوں۔

آپ اپنے اس کلام کو اس خاص فرمان میں جو آپ نے اس محروم طبقے کے بارے میں تحریر فرمایا ہے مکمل کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ تم بذاتِ خود بغیر کسی واسطے کے تمام حکومت اسلامی میں ان کے حالات کے بارے میں باخبر رہو اور ہمیشہ ان کے معاملات کے جویا رہو تاکہ ان کے ساتھ مکمل انصاف کیا جا سکے پھر اس مقصد کے لئے کہ محروم اور مظلوم انسان تمہارے مصاحبوں اور درباریوں کی وجہ سے بالکل مجبور

نہ ہو جائیں اور تم تک ان کی رسائی نہ ہو سکے۔ امام علیہ السلام فرماتے ہیں۔

واجعل لذوی الحاجات منک قسماً تفرغ لهم فیه شخصک وتجلس لهم مجلساً عاماً
فتتواضع فیه لله الذی خلقک وتقعد عنهم جندک واعوانک من احراسک وشرطک حتی یکلمک
متکلمهم غیر متتعتع فانی سمعت رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم یقول فی غیر موطن لن
تقدس امه لا یؤخذ للضعیف فیها حقه من القوی غیر متتعتع۔

"صاحبان ضرورت کے لئے اپنے اوقات کا کچھ حصہ مخصوص کر دو تاکہ تم ہر چیز سے بے فکر ہو کر ان کے ساتھ مشغول ہو سکو۔ اور ایک جلسۂ عام میں بیٹھ کر جس کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوں اور ان کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ۔

اللہ کے لئے جو تمہارا خلق کرنے والا ہے اپنے نگہبانوں اور محافظوں کو اس جلسہ سے دور رکھو تاکہ نہایت آزادی سے بغیر کسی خوف و دہشت کے بات کر سکیں اس لئے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ مختلف مواقع پر فرمایا کرتے تھے جو امت ضعیفوں کے حق کو صاحبانِ طاقت سے نہ لے سکے وہ کامیابی کا راستہ کبھی نہ دیکھ سکے گی"۔

نہ صرف اس فرمان میں بلکہ اپنے فرزندوں اور تمام دوستوں سے وصیتوں میں بستر شہادت پر بھی فرمایا کرتے تھے۔

تاریخ میں آپ نے کہیں پڑھا ہے کہ ایک حاکم اپنے محکوم کو ایک جائز دعوت مہمانی میں شرکت پر اس طرح تنبیہ کرے جیسی کہ حضرت علی علیہ السلام نے عثمان بن حنیفؓ کو فرمائی ہے وہ صرف اس دلیل پر کہ صاحبان ثروت اس دسترخوان پر موجود تھے۔ اور غریب و نادار اشخاص وہاں محروم اور ممنوع۔ کہیں آپ نے سنا ہے کہ کوئی حاکم اپنے محکوم کے لئے اس امر کو بدترین درد شمار کرے کہ وہ رات کو پیٹ بھر کر سوئے اور جس کے چاروں طرف بھوکے لوگ ہوں۔

وحسبک داءً ان تبیت ببطنة
وحولک اکباد تحن الی القدر

حضرت علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں اپنے خطوط میں اس امر پر انتہائی

ناراضگی اور تکلیف کا اظہار فرماتے ہیں کہ لشکر آبادیوں سے گزرتے وقت ان کا مزاحم ہو وہ اہل دنیا کی سیاست جو کہ معمولات پر اثر انداز ہو جاتی ہے اور وہ حضرت کے وقت ان کی تیز رفتاری کو کوئی قابل اعتراض چیز نہیں سمجھتے ہیں اس کو آپ انتہائی ناپسندیدہ خیال فرماتے تھے۔ نہج البلاغہ کے ساٹھویں خط میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ اہل لشکر شہروں اور دیہاتوں سے گزرتے وقت ذرا سی بھی تکلیف وہاں کے رہنے والوں کو نہ پہنچائیں اور کسی قسم کا ان کا مال غصب نہ کریں لیکن یہ کہ انتہائی ضرورتمند ہوں۔ بھوکے ہوں کہ جس سے ان کی جان خطرہ میں پڑنے کا اندیشہ ہو ایسے وقت میں حفاظت جان کے لئے بقدر ضرورت لے سکتے ہیں۔ خاص طور سے اس خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ میں بذات خود لشکر کے پیچھے چل رہا ہوں اگر کسی قسم کی کوئی شکایت ہو تو وہ مجھے پہنچائی جائے تاکہ میں اس کا انتظام کر سکوں۔

امیر المؤمنین کی شخصی زندگی مسطور نہج البلاغہ میں وضاحت کے ساتھ تحریر میں آتی ہے آپ ان تمام لوگوں کے لئے ایک کامل نمونہ ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ مستضعفین کے ساتھ مکمل ہمدردی کی جائے۔ اور ان کے ہر دکھ درد کا علاج کیا جائے اور ان کی ہر تکلیف کو دور کیا جائے آپ ہر جگہ اور ہر مقام پر ایسے طالبان اصلاح کے ہمراہ ہیں۔

مختصر بات یہ ہے کہ نہج البلاغہ مصائب و آلام میں مظلوموں کے ساتھ ہے اور ظالموں اور بے رحم لوگوں کی سخت ترین دشمن ہے۔ اس دلیل سے ایک سب سے بڑی شرط جو آپ لشکر کے سرداروں کے لئے ضروری خیال کرتے ہیں یہ ہے کہ وہ لوگ طاقتور لوگوں کے مقابلہ میں طاقتور اور کمزوروں اور ضعیفوں کے لئے نرم دل اور مہربان ہوں۔

(۳) نہج البلاغہ اور آزادی۔

ہمیں یہ بات معلوم ہے کہ سب سے اہم انسانی مقصد پیغمبران خدا یہ ہے کہ وہ انسانوں کو قید ظلم سے آزادی دلائیں کہ جو اس ارشاد کے مطابق

maablib.org

آپ نہایت وسیع پیمانے پر انجام دیتے تھے۔ نہج البلاغہ میں یہ بنیادی مقصد پیغمبران خدا کا رشتۂ تحریر میں آیا ہے۔ جہالت اور لاعلمی کی قید سے آزادی جو خودغرض ظالموں کی جسارت کا سرچشمہ ہے اور ان کے ظلم وستم پر قدرت ہے خواہشات نفسانی، حرص وہوس اور تمام رذائل سے آزادی جس کو اسلام کی زبان میں جہادِ اکبر کہا گیا ہے۔

خاص طور سے خطبوں، خطوط اور مختصر کلمات وغیرہ میں تمام جگہوں پر جس قدر نفس کے ساتھ جہاد کی تاکید کی گئی ہے اس سے زیادہ اور کسی موضوع پر اتنی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے کچھ لوگ عام طور سے سمجھتے ہیں کہ یہ خطبے اور تقریریں صرف ایک اخلاقی گفتگو ہیں ایسا نہیں بلکہ براہ راست یہ اجتماعی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے کہ بہت سی شکستیں اور پسماندگیاں اخلاقی انحطاط ہی سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً خودغرضی اور حسد، تکبر وغرور اور خودپسندی۔

(۴) ، نہج البلاغہ عدالت اجتماعی کی ایک پکار۔

ایسی دنیا کہ جس میں ظلم وستم ہر طرف چھایا ہوا ہے اور ظالم مظلوموں کا خون چوسنے میں لذت محسوس کر رہے ہیں جہاں کہیں بھی طلبِ عدالت کا نعرہ الاپا جائے درست ہے لیکن اگر اس کا انتظام تمام عالم کے مقامات کے لئے کیا جائے تو اس سے بہتر اور کون سی شئے ہو سکتی ہے۔ نہج البلاغہ کی آب وتاب کی صرف یہی ایک دلیل کافی ہے کہ وہ ہر جگہ کے لئے عدالت وانصاف کی منادی ہے اور ہر جگہ مظلوموں کی ہمدرد اور ظالموں سے جنگ کرنے والی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کے پرافتخار خطوط ہر جگہ دعوتِ عدالت دینے والے اور ستمگارانِ روزگار کے خلاف جنگ پر آمادہ کرنے والے ہیں۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اگر تم یہ کہو کہ نہج البلاغہ مظلوموں کی حمایت اور ظالموں سے جنگ کا ایک مکمل آئین ہے اور ہمیشہ اس شیریں چشمے کے اطراف میں عدالت وانصاف کے

پیاسے جمع رہتے اور اس سے اپنی عدالت کی پیاس بجھاتے ہیں۔ نہج البلاغہ کی کشش کے اسباب میں سے ایک قوی سبب یہ ہے کہ جس میدان میں یہ قدم رکھتی ہے اور حقائق کو بیان کرتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مقرر اس میں ید طولیٰ رکھتا ہے اور اسی موضوع کے غور و خوض میں اپنی پوری زندگی گزاری ہے۔ جس وقت امام علیہ السلام توحید باری تعالیٰ کے موضوع پر گفتگو کرتے ہیں تو ہماری نظر میں ایک الٰہی فلسفی مجسم ہو کر سامنے آجاتا ہے آپ سے بہتر اسرار صفات جمال و جلال خداوندی پر کسی نے گفتگو نہیں کی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مقرر نے اپنی عمر کا کثیر وقت اسی موضوع کی تیاری میں صرف کر دیا ہے اور یہی موضوع اس کا خاص الخاص موضوع ہے۔ جبکہ معصوم امام خلاق عالمین کی توحید پر گفتگو کرتے ہیں اور صفات جلال و جمال الٰہی پر روشنی ڈالتے ہیں تو اپنا مثیل و نظیر نہیں رکھتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقرر کا موضوع خاص یہی ہے اور اسی میں اس نے اپنی زندگی صرف کی ہے نہ وہ تجسیم کی طرف قدم اٹھاتے ہیں اور نہ تعطل صفات (صفات کو بیکار قرار دینا) کی طرف اور پروردگار عالم کا ایسا تعارف کراتے اور معرفت الٰہی پر روشنی ڈالتے ہیں کہ پڑھنے والا ہر چہار زمین و آسمان حتیٰ کہ اپنی روح میں ذات پروردگار کو محسوس کرتا ہے اور اسے ہر طرف خدا ہی خدا نظر آتا ہے اور وہ معرفت الٰہی سے سرشار ہو جاتا ہے۔

جب ہم نہج البلاغہ کی ورق گردانی کرتے ہیں تو ہماری نظر جہاد سے متعلق خطبوں پر ٹھہر جاتی ہے۔ ہم ایسے سخی اور بہادر و عابد کو دیکھتے ہیں کہ جو جنگی لباس پہنے ہوئے دقیق ترین قواعد جنگ اور اس کے گر اپنے ماتحتوں کو سکھاتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی عمر اسی میدان میں صرف کی ہے اور جنگ کے علاوہ اس کا کوئی مشغلہ ہی نہیں رہا ہے۔ ہمیں نہج البلاغہ کے مطالعہ میں یہ نظر آتا ہے کہ امام علیہ السلام حکومت کی کرسی پر جلوہ فرما ہیں وہ حکومت کے آداب و شرائط اپنے صوبہ داروں اور ناظمان حکومت کے لئے بیان کر رہے ہیں۔ تمدن کے عروج و زوال پر سیر حاصل گفتگو کر رہے ہیں۔ ظالم قوموں کی سرنوشت اور اجتماعی سکون و آرام کے قواعد و ضوابط اور سیاسی و فوجی مسائل

مسائل اطمینان بخش دلائل کے ساتھ طالبانِ ہدایت کے لئے بیان کر رہے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص نے حکومت کے علاوہ اپنی ساری عمر کوئی کام ہی نہیں کیا ہے ۔

پھر ہم ورق پلٹتے ہیں تو امام علیہ السلام کو مسندِ اخلاق و تہذیبِ نفوس پر جلوہ افروز دیکھتے ہیں ایک عاشقِ صادق اصلاحِ نفس کا طالب (ہمام) تزکیہ نفس اور تربیتِ ذات کے لئے ایک نئے خطبہ کی درخواست کرتا ہے اور وہ ایسے پیاسا ہوا ہے کہ ایک دو جام سے سیراب ہوتا نظر نہیں آتا، امام علیہ السلام اپنے علمِ لدنی اور معرفتِ الٰہی کے دروازے اس کے قلبِ صادق پر اس طرح وا کرتے ہیں اور عشقِ الٰہی کا درس اور بے تعلقیٔ دنیا کا سبق اسے پڑھاتے ہیں اور پرہیزگاروں کی صفات سے تقریباً سو صفتیں اس کے سامنے بیان کرتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ اسی موضوع پر فکر کی ہے اور دنیا کے کسی مشغلہ سے سروکار نہیں رکھا ہے ۔ ایسے پُر اثر انداز میں اصلاحِ نفس اور راہِ معرفت کے متلاشیوں کے لئے بیان کرتے ہیں گویا کہ زمانہ دراز تک آپؑ نے مسندِ اخلاق پر قیام فرمایا ہے آپؑ اس طرح بے تعلقیٔ دنیا کے موضوع پر گفتگو فرماتے ہیں کہ سائل (ہمام) اس بیان کو سننے کے بعد ایک چیخ مارتا ہے اور اس کی لاش زمین پر گر جاتی ہے ۔ کلام کے اس درجہ پُر اثر ہونے کی مثال سابقہ تاریخ میں نہیں ملتی

در حقیقت نہج البلاغہ کی یہ تفصیلات کہ جن میں سے ہر ایک اپنی نوع میں عدیم المثال ہے انتہائی حیرت انگیز اور تعجب افزا ہیں ۔ ماحصل گفتگو یہ ہے کہ نہج البلاغہ ایک ایسی کتاب ہے جو اس زمانہ میں اور آئندہ آنے والے زمانوں، موجودہ نسل اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے نمونہ کامل ہے، راہبر اور راہنما ہے ان تمام مقامات پر جہاں جہاں سورج طلوع ہوتا ہے یا موسم بہار آتا ہے بجلیاں چمکتی ہیں، طوفان آتے ہیں اور موجیں شور برپا کرتی ہیں خشکی کرنا قابل فہم ستاروں کی انتہائی بلندیوں اور آسمانوں کی حیرت افزا رفعتوں تک ۔

ہزار سالہ جشنِ نہج البلاغہ کے موقع پر عالمی کانفرنس میں پڑھا گیا مقالہ ۔

بشکریہ بنیاد نہج البلاغہ تہران

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب سیّد محمد تقی

انگریزی سے ترجمہ جناب پروفیسر سردار نقوی

نہج البلاغہ،
عقلیّت خیز تحریکوں کے ماخذ کی حیثیّت سے

نہج البلاغہ فصاحت و بلاغت کا ایک ایسا شاہکار اور تاریخ گیر اور تاریخ ساز خطبات و کلمات کا ایک ایسا نادر مجموعہ ہے جو اپنے دَورِ تدوین سے آج تک بلکہ صحیح تر بات یہ ہے کہ جس وقت ان کلمات اور خطبات کو ارشاد فرمایا گیا اُس وقت سے آج تک تاریخ کے ہر دور میں اعلیٰ ترین اخلاقی اقدار کے حامل ادبِ عالیہ کے بے مثل اور ناقابلِ تقلید نمونے کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن عصرِ حاضر اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم اس سرچشمۂ علم و حکمت پر نسبتاً مختلف سطح سے گفتگو کریں اور ماضی کی روایت سے ہٹ کر جدید تناظر میں اس کتاب کی عظمت اور اہمیت کو دریافت کرنے کی سعی کریں۔ گفتگو کی یہ نئی اور جدید سطح اپنی اہمیت کے اعتبار سے اگر پُرانی سطح سے زیادہ اہم نہیں ہے تو بھی اس کے مساوی ضرور ہے۔ اگر فکری اور ثقافتی تناظر میں اس کتاب کی اہمیت کا مطالعہ کیا جائے تو ہم پر یہ حیرت انگیز حقیقت منکشف ہو سکے گی کہ یہ عظیم کتاب، جس کے توسط سے حضرت علیؑ عالمِ انسانیّت سے مخاطب ہیں۔ تاریخ فکر و ثقافت میں ایک منارۂ نور کی حیثیّت رکھتی ہے۔ عقلیّت کی تحریک ایک بڑا دشوار گزار راستہ ہے جس پر فکرِ انسانی کا ہر قدم نہایت احتیاط اور تدبر کے ساتھ اُٹھایا گیا ہے۔ اس تاریخ میں ”نہج البلاغہ“ ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور علیؑ تاریخِ انسانی کی وہ منفرد اور بے مثل شخصیت ہیں جنھوں نے عقلیّت

اور مذہب کے درمیان توافق اور ہم آہنگی کے امکانات کو روشن اور اجاگر کیا۔

عقلیت کی تحریک کی ابتدا چھٹی صدی قبلِ مسیح میں یونان سے ہوئی۔ یونان کی عقلی فضاؤں میں عقلیت اور دیومالائی قصے کہانیوں کے درمیان تضادات ابھر کر سامنے نہ آسکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کوئی بھی ہوش مند انسان عقل کی صحت اور عظمت کو چیلنج کرنے کے کسی امکان کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن تیسری صدی عیسوی میں یہودیت کے عَلم بردار مفکرین نے یہ محسوس کیا کہ یونانی فکر کے عقلیت پسندانہ رجحانات سے ان کے نظریات اور تصورات پر کاری ضرب پڑ رہی ہے۔ چنانچہ علماء کے اس گروہ نے جن میں فیلو کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ عقلیت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتے ہوئے یہ اعلان کر دیا کہ عقل اس بات کی اہل نہیں ہے کہ اسے عقائد کے باب میں آخری حکم بنایا جاسکے۔

یہی وہ نقطہ ہے جس کے بعد عقلیت اور مذہب کے درمیان تضاد اور تصادم کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے نوعِ انسانی کی تمام فکری اور تہذیبی تاریخ کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ انسانیت کی تمام فکری تاریخ اسی تضاد اور تصادم سے عبارت نظر آتی ہے البتہ اس میں صرف ایک استثناء ہے اور یہ وہ تحریک ہے جس کا سرچشمہ قرآنِ حکیم اور پھر نہج البلاغہ ہے۔ اگر ہم عقلیت کی تاریخ کا معروضی مطالعہ کریں تو ہم اس حقیقت کا ادراک کر سکتے ہیں کہ فکرِ انسانی کی تاریخ میں عقلیت اور مذہب کے درمیان مکمل ہم آہنگی دریافت کرنے کا کارنامہ پہلی بار حضرت علیؑ نے انجام دیا اور یہ کارنامہ ساتویں صدی عیسوی میں انجام دیا گیا۔ یورپ میں نشاۃ ثانیہ

کی تحریک جو عقلیت کی علم بردار ہے، چودھویں صدی عیسوی میں اٹلی سے شروع ہوئی اور سترھویں صدی تک (یعنی ۳۰۰ سال میں) یہ تحریک مغربی یورپ کے تمام ممالک میں پھیل گئی۔ حضرت علیؑ کا دور مغرب میں نشاۃ ثانیہ کے دور سے کم از کم سات سو سال قبل ہے گویا نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے آغاز سے سات سو سال قبل حضرت علیؑ نے انسانیت کو عقلیت اور مذہب میں ہم آہنگی کا مژدہ سنا کر تاریخ فکرِ انسانی میں عقلیت کے چراغ روشن کر دیئے تھے۔

قرونِ وسطیٰ کے دور میں جو پانچویں صدی عیسوی سے چودھویں صدی عیسوی تک پھیلا ہوا ہے۔ عقیدے کی عقل پر برتری کو ایک مسلّمہ حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جاتا رہا اور یہ سمجھا جاتا رہا کہ کسی معاشرے میں مذہب اور سائنس یا عقلیت پسندی کے رجحانات ایک ساتھ پروان نہیں چڑھ سکتے اس لیے کہ ان دونوں رجحانات میں ایسا تضاد ہے جس کا نتیجہ تصادم کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ مغرب میں یہ تضاد اور تصادم پوری شدت اور سنگینی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ تاریخ کے ساتھ انصاف کا تقاضا ہے کہ یہاں اس امر کی نشاندہی کر دی جائے کہ بعض معاشروں نے عقلیت اور مذہب کے تضاد کو خوش اسلوبی سے حل کر کے خود کو تصادم کی حالت سے محفوظ کر لیا تھا، مثال کے طور پر ہندو مت، بدھ مت، تاؤازم، اور شنٹوازم کے معاشروں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔

باوجودیکہ انسان نے اپنی تہذیبی اور ثقافتی تاریخ کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس تاریخ کے مختلف گوشوں، مختلف فکری زاویوں اور عملی کارناموں پر بہت زیادہ تحقیقی مطالعہ کیا ہے اور فکرِ انسانی کی ترقی کا سراغ لگانے کی ہر ممکن سعی کی گئی ہے مگر مقام حیرت ہے، عقلِ انسانی کا محیّر العقول کارنامہ

نہج البلاغہ، علماء، مفکرین اور محققین کی توجہ اور مطالعے کا ہدف نہ قرار پا سکا اور اس کی طرف وہ توجہ نہ کی گئی جس کی یہ کتاب مستحق ہے۔

جہل و غفلت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ایک آواز برق کے کوندے کی طرح لہرائی اور پوری تاریخ کو منور کر گئی، یہ روشن اور تابناک آواز علیؑ ابن ابی طالبؑ کی تھی جن کا شمار نوعِ انسانی کی چند عظیم ترین شخصیتوں میں کیا جاتا ہے۔ علیؑ نے ساتویں صدی ہجری کے عہدِ جاہلیت میں عرب کے ریگستان میں علم و معرفت کے دریا بہائے اور یہ تاریخ ساز اور انقلاب آفریں فکر پیش کی کہ عقیدہ اور مذہب سمیت تمام معاملات میں عقل آخری حکم ہے، مذہب تشیع اس فکری روایت کی زندہ علامت ہے، تاریخ عقلیّت کی مختلف تحریکوں کے مطالعے اور محاکمے کے بعد ہم اس بدیہی حقیقت کو معلوم کر سکتے ہیں کہ معتزلہ کی تحریک جس کا آغاز صدرِ اسلام میں ہوا، وہ واحد تحریک ہے جس نے عقیدے پر عقل کی برتری کو ایک مسلّم اصول کے طور پر تسلیم کیا اور ہر معاملے میں کسی استثناء کے بغیر عقل کو حکمِ آخر قرار دیا۔

معتزلہ تحریک کا بنیادی اختصاص یہ ہے کہ وہ عقل کو آخری حکم قرار دیتی ہے۔ آخری حکم سے مطلب یہ کہ ہر قسم کے عقائد کی کسوٹی عقل اور صرف عقل ہے۔ یعنی یہ فیصلہ کہ کون سا عقیدہ صحیح اور کون سا غلط ہے، صرف عقل کی ترازو پر تولا جا سکتا ہے اور صرف عقل کی روشنی میں طے کیا جا سکتا ہے۔ یونان اور دیگر قدیم معاشروں کے مفکّرین نے کبھی عقل کی برتری سے انکار نہیں کیا، اس مذموم روایت کا سلسلہ اسکندریہ کے یہودی مفکّر فیلو سے شروع ہوا جس نے علم کلام کی بنیاد ڈالی۔ بعد میں عیسائی علماء اور پھر مسلم مفکّرین بھی اس فکر سے متاثر نظر آتے ہیں، قرآنِ حکیم نے عقلیّت سے انحراف کی

نفی کر کے عقل کی مرکزیت کو بحال کیا ہے اور حضرت علیؑ نے اس نقطۂ نظر کو اس وضاحت اور شدت سے پیش کیا کہ ان کی ذات عقلیت کی مختلف تحریکوں کے سرچشمے کی حیثیت رکھتی ہے، معتزلہ تحریک کو عام طور سے واصل بن عطاء سے منسوب کیا جاتا ہے مگر تیسری صدی ہجری کے معتزلہ مفکرین کی جو کتابیں اس صدی میں دستیاب ہوئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتزال کی فکری تحریک حضرت علیؑ سے چلی ہے۔ حضرت علیؑ، حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے جو اقوال معتزلہ مفکرین نے نقل کیے ہیں وہ اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس تحریک کا حقیقی سرچشمہ انہی ہستیوں کے اقوال و افکار ہیں۔

ہمارا سلسلۂ گفتگو اس بحث کو مزید بڑھانے کا متحمل نہیں ہو سکتا اس لیے ہم اس بحث کو یہیں روک کر اپنے اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ہمارا اصل معروضہ یہ ہے کہ نہج البلاغہ ایسے اقوال و افعال کا مجموعہ ہے جو عقلیت کی تحریکوں کے لیے سرچشمے کی حیثیت رکھتا ہے، حضرت علیؑ کے کلمات عقلیت کے رہنما اصول ہیں۔ افلاطون کا قول ہے "میں اُدھر ہی جاؤں گا جدھر مجھے دلیل (عقل) لے جائے گی" حضرت علیؑ نے دنیا کے دانش وروں اور اہلِ فکر کو یہ اصول دیا کہ "یہ مت دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے، یہ دیکھو کہ کیا کہہ رہا ہے۔ دونوں اقوال میں ایک ہی اصول کو اجاگر کیا گیا ہے یعنی عقل کی برتری اور مرکزیت، نہج البلاغہ میں ایسے متعدد اقوال ہیں جو عقل کی برتری پر دلالت کرتے ہیں اور فکرِ انسانی کی عقلیت کی طرف رہنمائی کرنے والے ہیں۔

ہر وہ شخص جس نے تاریخِ انسانی کی فکری تحریکوں کے ارتقاء کا مطالعہ اور اس ارتقاء کے اسباب و محرکات پر غور و فکر کیا ہے اس بات کا اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اسلام کی تین بڑی اور اہم تحریکوں — تشیع، اعتزال

اور تصوف کا فکری سرچشمہ حضرت علیؑ کی ذاتِ گرامی ہے۔ تصوف کا اپنا ایک مخصوص مسلک ہے مگر اس تحریک نے مسلم فکر پر بڑے گہرے اور ہمہ گیر اثرات مرتب کیے ہیں، معتزلہ کی تحریک عہدِ اسلام میں عقلیت اور فلسفیانہ اندازِ نظر کے فروغ کا اصل محرک کہی جا سکتی ہے اور خود تحریکِ اعتزال کا سرچشمہ مسلکِ تشیع ہے۔

جہاں تک تحریکِ تشیع کا تعلق ہے، ادیانِ عالم کی تاریخ میں اسے یہ خصوصی امتیاز حاصل ہے کہ اس تحریک نے عقل اور عقیدے کی دوئی مٹا کر عقلیت اور مذہب کے درمیان وحدت اور ہم آہنگی قائم کی۔ تاریخِ ادیانِ عالم کا مطالعہ کرنے والے اس بات کو نہایت خوشگوار حیرت سے دیکھتے ہیں کہ وہ کتاب جو عقائدِ تشیع کے باب میں ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی ابتداء کتاب العقل سے ہوتی ہے، میری مراد کتاب الکافی سے ہے، الکافی کا پہلا باب کتاب العقل ہے، جس میں عقل کی اہمیت، فضیلت اور مرکزیت کے متعلق حدیثوں کی ایک بڑی تعداد نقل کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر امام جعفر صادقؑ کے حوالے سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ جبرئیلؑ حضرت آدمؑ کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ وہ تین نعمتوں، یعنی عقل، ایمان اور حیا میں سے کوئی ایک منتخب کر لیں، حضرت آدمؑ نے عقل کو منتخب کر لیا جو اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ تمام معاملات میں مرکزیت عقل کو حاصل ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ بعض علماء نے الکافی کے مرتب علامہ کلینی پر یہ اعتراض کیا کہ انھوں نے اپنی کتاب میں پہلا باب عقل کے متعلق کیوں رکھا ہے۔ انھیں چاہیے تھا کہ پہلے وہ توحید، عدل اور نبوت جیسے موضوعات کو جگہ دیتے۔ الکلینی نے جو جواب دیا وہ نہایت واضح اور معنی خیز تھا۔ انھوں

نے فرمایا کہ توحید، عدل یا نبوّت پر ایسے اعتقاد کا کیا فائدہ ہے جس کی بنیاد عقل پر قائم نہ ہو۔ اس جواب سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مکتبِ تشیع میں عقل کو وہ رہنما اصول تسلیم کیا جاتا ہے جو دینی معاملات میں ہدایت کے لیے ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ عقل کی مرکزیّت اور اہمیت پر اس قدر شدید اصرار مکتبِ تشیع کے علاوہ اور کہیں مشکل ہی سے نظر آ سکے گا۔

اس موقع پر یہ اعتراض مناسب نہ ہوگا کہ چونکہ ہر شخص کی عقل کا پیمانہ دوسرے شخص سے مختلف ہے اس لیے عقل کو کسی معاملہ میں بحکم آخر بنانا درست نہیں ہے، بات یہ ہے کہ اصل مسئلہ کسی فیصلے کی مطلق صحت یا عدمِ صحت کا نہیں ہے بلکہ مسئلہ طریقِ کار کا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ کسی معاملے میں آپ کیا فیصلہ کرتے ہیں بلکہ اصل اور بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ آپ کس طرح فیصلہ کرتے ہیں، کسی قضیئے کو حل کرنے کے لیے آپ کیا طریقِ کار اختیار کرتے ہیں، عقلیّت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ہر مسئلے پر عقل کی روشنی میں فیصلہ کرے۔ فیصلہ کرنے کے لیے دلیل اور برہان سے کام لے، استدلال کا طریقِ کار اختیار کرے۔ اس بات کا امکان ہے کہ کسی مسئلے پر کوئی شخص غلط ستدلال کر کے غلط نتیجے پر پہنچ جائے لیکن یہ بات کہ اس نے جو طریقۂ کار ختیار کیا ہے وہ صحت پر مبنی ہے خود اس اَمر کی ضمانت ہے کہ اس کے لیے ست نتائج پر پہنچنے کے قوی امکانات موجود ہیں، اور بالآخر اس کی عقل س قدر تربیّت یافتہ ہو جائے گی کہ وہ اکثر معاملات میں درست نتائج پر پہنچنے میں کامیاب ہو سکے گا۔

درحقیقت عقلیّت اسی طریقۂ کار سے عبارت ہے، مکتبِ تشیع اپنے نے والوں سے یہی تقاضا کرتا ہے کہ وہ ہر معاملے کو عقل کی کسوٹی پر پرکھیں اور

کسی بھی نظریے، عقیدے یا اصول کو عقل کی بنیاد پر قبول یا مسترد کریں، اِس مکتب میں فقہ کی بنیاد چار اصولوں پر رکھی گئی ہے یعنی قرآن، حدیث، اجماع اور عقل اِن چار اصولوں میں عقل کی مرکزی اہمیت کا اندازہ اِس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اگر کسی معاملے میں قرآن و حدیث کی تفسیر و تعبیر یا علماء کا اجماع عقل کے فیصلے سے براہِ راست متصادم ہو تو اُسے مسترد کیا جا سکتا ہے۔ دنیا کے کسی دوسرے مذہبی مکتبِ فکر میں اِس طرح کی مثال ڈھونڈنا محض تضیعِ اوقات ہوگا۔ عقل کی برتری اور مرکزیت مکتبِ تشیع کا اختصاص اور امتیاز ہے اور اِس اعتبار سے اِس مکتب کو اِنسانیت کی فکری اور ثقافتی تاریخ میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔

اِسی طرح مکتبِ تشیع کو تاریخِ مذاہب میں ایک اور انقلابی تصوّر پیش کرنے کا امتیاز بھی حاصل ہے۔ یہ انقلابی تصوّر اجتہاد کا وہ اصول ہے جو مذہب اور بدلتے ہوئے تاریخی اور عمرانی تقاضوں میں تطابق اور ہم آہنگی پیدا کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ مسلمانوں کے دیگر فقہی مکاتیب میں کسی حد تک اجتہاد کا تصوّر پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ مذہب میں اجتہاد کے اصول کو متعارف کرانے کا سہرا عقلیت کی اسی تحریک کے سر ہے جس کا سرچشمہ پیغمبرؐ کے اہلِ بیت ہیں، اصولِ اجتہاد کی روشنی اسی گھر سے طلوع ہوئی اور پھر یہ اصول اسلام کے مختلف فقہی مکاتیب میں کسی نہ کسی حد تک سرایت کر گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم معاشرے نے عقلیت اور استدلال کا درس اہلبیتؑ پیغمبر سے لیا، مسلم معاشرے میں اِس اندازِ نظر کا فروغ معتزلہ تحریک کے ذریعے ہوا، اشاعرہ کی تحریک، تحریکِ اعتزال ہی کی شاخ ہے، قیاس، مصالحِ مرسلہ اور اسی طرح کے دیگر اصول جو بدلتے ہوئے معاشرتی تقاضوں کا جواب دینے کے لیے وضع کیے گئے اُن سب کا سرچشمہ یہی اجتہاد کا اصول ہے، لیکن جو

انسانیت کی فکری اور ثقافتی تاریخ کے تناظر میں نہج البلاغہ کی عظمت اور اہمیت اور اس کے مقام و مرتبہ کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ ہمیں اس حقیقت سے متعارف کراتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے مغرب میں مذہب اور سائنس کا تصادم اس قدر شدید اور سنگین صورت اختیار کر گیا تھا کہ کلیسا کے نمائندوں کے لیے عقلیت ایک قابلِ نفرت شے بن گئی تھی۔ عقلیت کی طرف یہ رجحان کم و بیش بارہ صدیوں کے طویل عرصہ پر پھیلا ہوا ہے آج بھی مغرب میں عیسائیت اور یہودیت کے مذہبی قائدین اور مشرق میں مکتبِ اشاعرہ کے نمائندے عقلیت کو شجرِ ممنوعہ قرار دیتے ہیں اور کسی شخص کی طرف سے محض عقلیت کا تذکرہ انھیں اس قدر مشتعل کر دیتا ہے کہ وہ ایسے شخص کو مردود اور قابلِ گردن زنی قرار دینے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔

مغرب کی فکرِ جدید کو عقلیت کا علم بردار سمجھا جاتا ہے، یہ بات ٹھیک ہے کہ آج کا مغرب کلیسائی عقائد کے مقابلے میں سائنسی حقائق کو ترجیح دیتا ہے اور یوں بالواسطہ عقیدے کے علی الرغم عقلیت کا علم بردار ہے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ سائنسی علوم کی بنیاد تجربے اور مشاہدے پر رکھی گئی ہے۔ اس لحاظ سے مغرب کی جدید فکری تحریکیں اپنے جوہر میں عقلی سے زیادہ تجربی ہیں۔ یہ تو آج کے مغرب کی صورتِ حال ہے، جہاں تک مشرق کا تعلق ہے، مشرق کے بیشتر مذاہب (اسلام کے علاوہ) عقل اور عقیدے کی بحث میں غیر جانبدار نظر آتے ہیں۔

صورتِ حال کا بنظرِ عمیق مطالعہ کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ گزشتہ چار صدیوں کے دوران مغربی دنیا میں عقلیت کی جگہ تجربیت نے سنبھال لی ہے اور اس اعتبار سے عقل کی مرکزیت اور اہمیت کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔ اس تناظر میں یہ کہنا درست ہوگا کہ عہدِ جدید عقلیت کا نہیں تجربیت کا عہد ہے، لیکن یہاں اس بحث کو چھیڑنا پنڈورا کے صندوق کو کھولنے کے مترادف ہوگا، اس پیچیدہ اور

دقیق مسئلے پر میں نے اپنی انگریزی کتاب (زیرِ طبع) کائنات ۔ ایک نیا تصور میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ۔

اس موقع پر جس اہم حقیقت کی نشاندہی کرنا ہے وہ یہ ہے کہ فکرِ انسانی کی تمام تاریخ میں یونانیوں کے عظیم فکری عہد کو چھوڑ کر جب عقل کو مرکزیت اور برتری حاصل تھی۔ اگر کوئی انسانی تصنیف عقلیت کی حرمت اور عظمت کا دفاع کرتی ہے، اس کی مرکزیت کو اجاگر کرتی ہے اور اسے تمام معاملات میں (دینی و دنیوی) حکمِ آخر ماننے پر اصرار کرتی ہے تو وہ نہج البلاغہ ہے۔ تاریخِ انسانی کی عظیم مذہبی کتب میں قدیم مصر کی کتاب اموات، ایران کی ژند، پاژند اویستا، ہندوستان کی عظیم ویدا، اپانیشد، بھگوت گیتا، انجیلِ مقدس اور قرآنِ حکیم شامل ہیں۔ ان میں قرآنِ حکیم اور اس کے بعد نہج البلاغہ وہ دو کتابیں ہیں جنھوں نے عقل کی حرمت کا اثبات کر کے اِس کو مذہب کی ضد قرار دینے کی بجائے مذہب کے بنیادی اصول کے طور پر پیش کیا ہے۔

قرآنِ حکیم نے انسانیت کو یہ مژدہ سنایا کہ "مَن یُؤتی الحِکمَۃَ فَقَد اُوتِیَ خَیراً کَثِیراً" یعنی "جسے حکمت عطا کی گئی گویا اُسے خیرِ کثیر سے نوازا گیا"۔ مقصد یہ کہ جوہرِ انسانیت حکمت ہے اور جسے حکمت کی دولت عطا کی جاتی ہے اُسے اللہ تعالیٰ خیرِ کثیر سے سرفراز فرماتا ہے، اور نہج البلاغہ وہ واحد کتاب ہے جس کا پیش کردہ تصورِ الوہیت اپنے جوہر میں بے مثال اور طریقِ پیشکش میں نہایت حکیمانہ ہے:

عہدِ جدید کی انسانیت کو ایک زبردست چیلنج کا سامنا ہے، وقت کے افق پر اکیسویں صدی کے سائے نہایت تیزی سے ابھرتے جا رہے ہیں۔ اکیسویں صدی کے جلو میں ایک طرف انسانی ترقی کے بے پناہ امکانات ہیں تو دوسری طرف تباہی اور خونریزی کے ہولناک خطرات بھی ہیں۔ اس زبردست چیلنج کا مقابلہ صرف ایک ایسے دین کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے جس کی بنیاد عقلیت پر ہو، انسانیت کی نجات اور فلاح کا راستہ

وسیع النظری اور مخالفانہ نقطہ نظر کو برداشت کرنے کی تعلیم مکتبِ اہلِ بیتؑ کا خاصہ ہے۔ اس کی مثال دنیا کے کسی اور مذہب میں نہیں مل سکتی۔

اس ضمن میں ایک واقعے کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، واقعہ یہ ہے کہ ایک نوجوان امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن سے ابنِ راوندی نامی ایک شخص کو جس نے قرآن مجید کے خلاف ایک کتاب لکھی تھی، قتل کرنے کی اجازت طلب کی۔ امام جعفر صادقؑ نے اس سے سوال کیا، تم ابن راوندی کو کیوں قتل کرنا چاہتے ہو؟ نوجوان نے جواب دیا کیونکہ وہ قرآنِ مجید کے خلاف ایک کتاب لکھ کر اس کتابِ مقدس کی توہین کرنے کا مرتکب ہوا ہے، نوجوان کا یہ جواب سُن کر امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ اگر ابنِ راوندی نے قرآن کے خلاف ایک کتاب لکھ کر اس مقدس صحیفے پر اعتراض کیے ہیں تو اُس کا واحد جواب یہ ہے کہ تم اُس کتاب کے جواب میں ایک کتاب لکھ کر اُس کے اعتراضات کو مسترد کر دو۔ پھر امامؑ نے تنبیہی انداز سے فرمایا کہ اس سے ابنِ راوندی کے قتل کا جواز کس طرح قائم ہو سکتا ہے یعنی محض اختلافِ رائے کے اظہار پر کسی شخص کو قتل نہیں کیا جا سکتا۔ عقلیت کا تقاضا ہے کہ مخالف کی دلیل کا جواب دلیل سے دیا جائے نہ کہ اُسے تشدد کا نشانہ بنایا جائے۔

یہ صرف ایک مثال ہے، اس طرح کے بہت سے واقعات اہلِ بیت کی تعلیمات میں پائے جاتے ہیں لیکن ایسی کسی واقعے کی کوئی ایک مثال بھی کسی دوسرے مذہبی نظامِ فکر میں تلاش نہیں کی جا سکتی۔

مسلم تاریخ میں عقلیت کے احیاء اور فروغ کا دور عباسی خلیفہ المامون کا دور مانا جاتا ہے لیکن اگر تاریخ کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو اس حقیقت کا سراغ لگایا جا سکتا ہے کہ تحریکِ عقلیت کے احیاء اور دانش و حکمت کے فروغ

کا اصل سرچشمہ سلسلۂ اہل بیتؑ کے آٹھویں امام حضرت علی ابن موسیٰ الرضاؑ کی شخصیت تھی، حضرت امام علی رضاؑ کے زیرِ اثر مسلمانوں میں عقلیت کو جو فروغ اور ارتقاء حاصل ہوا اُس نے نوعِ انسانی کی فکری اور تہذیبی تاریخ پر بڑے گہرے اور دُوررس اثرات مرتب کیے، مسلمانوں میں عقلیت کا فروغ اور ارتقاء مغرب کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک کا جس کا آغاز ۱۴ ویں صدی عیسوی میں اٹلی میں ہُوا پیش خیمہ تھا۔ اس اعتبار سے امام علی رضاؑ کی شخصیت جو عباسی خلیفہ مامون کے عہد میں مسلمانوں کے عقلیت کے فروغ کا سبب بنی۔ درحقیقت فکرِ انسانی کی تاریخ میں عقلیت کی تمام تحریکوں کے محرک کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے کہ مغرب کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک دراصل مسلمانوں کی عقلیت کی تحریک کا نتیجہ اور اُسی کی بازگشت کی حیثیت رکھتی ہے، فکرِ انسانی کے ارتقاء کی تاریخ لکھنے والوں نے اِن شخصیتوں کی نشاندہی سے اغماض کرکے جنھوں نے انسانیت کے فکری اور ثقافتی دھاروں کو مثبت سمت میں آگے بڑھانے میں محرک کا کردار ادا کیا ہے انصاف اور دیانت کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا۔

تاریخِ فکرِ انسانی کے اِس وسیع اور ہمہ گیر تناظر میں ہم نہج البلاغہ کی اہمیت کا ادراک بہتر طور پر کر سکتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ انسانیت کی فکری اور تہذیبی تاریخ میں نہج البلاغہ وہ نادر کتاب ہے جسے بجا طور پر عقلیت کی تحریکوں کا سرچشمہ کہا جاسکتا ہے، یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ نہج البلاغہ کے مصنّف نے تصورِ الوہیت کے باب میں جس بلند سطح پر گفتگو کی ہے یہ فکرِ انسانی کی وہ بلند ترین امکانی سطح ہے جس تک رسائی کسی دوسرے شخص کے لیے ممکن نہیں ہو سکتی، عقلیت پر مبنی نہج البلاغہ کا تصورِ الوہیت آج سے چودہ سو سال قبل پیش کیے جانے کے باوجود حیرت انگیز حد تک جدید فکر انگیز

اور نہایت جامع اور ترقی یافتہ ہے اگرچہ تصورِ الوہیت کے بارے میں مفکرین نے عموماً توحید کا اثبات اور شرک کی نفی کی ہے لیکن نہج البلاغہ کے مصنف کا اختصاص یہ ہے کہ اُنھوں نے تصورِ توحید کو اُس بلند ترین امکانی سطح تک پہنچا دیا ہے کہ تاریخِ فکرِ انسانی میں اُس کی کوئی مثال نہ اُس سے قبل ملتی ہے اور نہ اُس کے بعد تلاش کی جا سکتی ہے۔

توحید کے اثبات سے کیا مُراد ہے؟ اس موضوع پر نہج البلاغہ کی فکر بالکل منفرد اور انوکھی ہے۔ حضرت امام علیؑ نے مسئلہ توحید پر فکر کے نئے اُفق روشن کیے ہیں لیکن حیرت اور افسوس اس بات پر ہے کہ مسلم علماء اور متکلمین نے فکر کی اس بلند اور بے مثال سطح کی تفہیم اور تشریح کے لیے کوئی سعی نہیں کی۔ درانحالیکہ سلسلۂ اہلبیتؑ کے دیگر ائمہ برابر حضرت امام علیؑ کی پیش کردہ فکر کی بلندیوں اور باریکیوں کی نشاندہی اور وضاحت کر کے لوگوں کو دعوتِ فکر دیتے رہے، افسوسناک بات یہ ہے کہ اشاعرہ متکلمین نے اس باب میں بالکل مختلف اندازِ نظر اختیار کیا۔ نتیجتاً توحید کا مسئلہ جسے نہایت بلند فکری اور عقلی سطح پر سوچا جانا چاہیے تھا، ذیلی اور فروعی بحثوں کا موضوع بن کر رہ گیا ہے۔

نہج البلاغہ کا تصورِ الوہیت انسانی فکر کا شاہکار ہے، ندرت و علوئے فکر کا نمونہ ہے، حیرت انگیز حد تک جدید اور انقلابی ہے اور قرآن حکیم کے پیش کردہ تصورِ الوہیت کی علمی اور فلسفیانہ تفہیم و تشریح کا بے مثال اور پاکیزہ نمونہ ہے، نہج البلاغہ کے مصنف نے اس موضوع پر عام فکری سطح سے بہت بلند ہو کر گفتگو کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ”التوحید ان لا تتوھمہ“ گویا توحید یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدت کے اثبات کا تقاضا یہ ہے کہ اُسے تصور اور واہمے کی حد سے ماوراء تسلیم

کیا جائے اس لیے کہ جس چیز کا تصور کیا جا سکتا ہے وہ محدود ہو جاتی ہے اور جو چیز محدود ہو وہ خدا نہیں ہو سکتی؛ خدا ہر شے کا خالق ہے اور ہر شے اُس کی مخلوق ہے؛ جو مخلوق ہے وہ محدود ہے۔ خالق کی شان یہ ہے کہ اُسے محدود نہیں کیا جا سکتا وہ لامحدود ہے اُسے تصور میں لانے کا مطلب اُسے محدود کرنا یا بالفاظ دیگر خالق کو مخلوق کی سطح تک پست کرنا ہے اس لیے توحید کا تقاضا اس امر کا اعتراف ہے کہ اللہ کی وحدانیت توہم و تصور کی حد سے بالا ہے اور بے نیاز ہے۔“

تصورِ الوہیت کے متعلق نہج البلاغہ میں جو فکری مباحث چھیڑے گئے ہیں اُن میں ایک دلچسپ بحث اشیاء کے تضاد سے متعلق ہے، اس بحث میں ایک حیرت انگیز بات یہ کہی گئی ہے کہ خدا وہ ہے جو دو متضاد اشیاء میں مقارنت پیدا کر سکتا ہے یعنی دو ایسی اشیا جن کا یکجا ہونا ممکن نہیں ہے اُنھیں یکجا کر دینے پر قادر ہے۔ اس روشنی میں اب آپ جدید سائنس کے اس انکشاف پر غور فرمائیے کہ جوہر کے مرکزیے میں دو مثبت برقیے پروٹون اور نیوٹرون ایک ساتھ جمع ہیں جبکہ طبیعات کا یہ واضح اصول ہے کہ ایک جیسے ذرات ایک دوسرے کو دفع کرتے ہیں مگر جوہر کے مرکزیے میں طبیعات کے اس واضح اصول کے خلاف پروٹون اور نیوٹرون کا یکجا ہونا ایک ایسا راز ہے جس نے ماہرینِ سائنس کو حیرت زدہ کر رکھا ہے، کیا یہ بات بجائے خود دلچسپ اور حیرت انگیز نہیں ہے کہ ایک ایسا مسئلہ جس نے بیسویں صدی کے سائنسی ماہرین کو پریشان کر رکھا ہے کس طرح آج سے چودہ سو سال قبل گفتگو کا موضوع بنایا جا سکا کیا اسے نہج البلاغہ کی ندرت و علوئے فکر کی ایک دلیل نہیں کہا جا سکتا؟

نہج البلاغہ کے فکری مواد پر اپنی گفتگو کو یہیں ختم کرتے ہوئے اب ہم

یہ ہے کہ ہم نہج البلاغہ کے حکیمانہ پیغام کی گہرائیوں کو سمجھنے کی کوشش کریں، اس لیے کہ یہ عقلیت اور روحانیت کا وہ حسین اور متوازن امتزاج ہے جو اعلیٰ ترین ثقافتی اور انسانی اقدار اور انسانی وحدت، عظمت اور اخوت کا علم بردار ہے۔

(تہران میں عالمی نہج البلاغہ کانفرنس میں پڑھا گیا مقالہ)۔

(تقریباً)

۱۲۰۰۰ ہزار

اقوالِ امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہ السلام

پر مشتمل نادر و نایاب کتاب

غُرَرُ الحِکَم و دُرَرُ الکَلِم

کی پہلی جلد

اصل عربی متن اور اعراب کے ساتھ

"حِکمتِ بوترابؑ"

کے نام سے

زیرِ ترجمہ ہو کر انشاء اللہ بہت جلد زیورِ طبع سے آراستہ ہو رہی ہے

تحقیق و ترجمہ سیّد جاوید جعفری

ادارۂ فروغِ علمِ معصومؑ

206/9 - دستگیر سوسائٹی۔ کراچی 38

منشوراتِ الامام علیؑ

مقدمہ

علی وجدان

زیرِ ترتیب ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب ڈاکٹر علی شریعتی

علیؑ اور تنہائی

صرف علیؑ کا کمال ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے پوری عمر میں جتنی باتیں کیں۔ جتنے کلمات ارشاد فرمائے ان سب میں سب سے زیادہ اثر انگیز، خوبصورت، عمیق اور ثمر بخش جملہ ہے۔ وہ ہے۔

۲۵ سال کی خاموشی

یہ جملہ دنیا کے تمام انسانوں کو مخاطب کر رہا ہے۔ البتہ اُن انسانوں کو جن میں انسانیت ہے جو مولائے کائنات کو پہچانتے ہیں۔ ۲۵ سال کی خاموشی کوئی معمولی چیز نہیں وہ بھی سختیوں اور مصیبتوں کے ساتھ، پھر کسی گوشہ نشین اور تنہائی پسند شخص کی خاموشی نہیں۔ بلکہ ایک فعال اور زبردست شخص کی خاموشی۔ ان کی یہ خاموشی خود ایک بولتا ہوا جملہ ہے۔ بلکہ ایک کتاب ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ امام کبھی لفظوں سے بولتا ہے، اور کبھی سکوت کے ذریعے۔ کبھی کامیابیوں کے ذریعے اور کبھی ظلم سہہ کے ان کا تخاطب ہم سے ہے اور ہماری ذمہ داری بھی ہم کو معلوم ہے کہ ہم اس سبق کو یاد رکھیں۔ ان باتوں پر غور کریں اور ان خاموشیوں کو سمجھیں۔

ایک اور بات جس کا میں یہاں ذکر کر دوں کہ ایک اہم بیماری یہ

ہے ، کوئی مذہب یا کسی کی تعلیمات عوامیت کا شکار ہو جاتی ہیں جبکہ اکثر مذاہب شکار ہو گئے ۔ کیوں ......! اس کو میں اس طرح واضح کروں کہ آئین سٹائن کی تھیوری عوامیات کا شکار نہ ہو سکی کیونکہ اس کا موضوع ایسا ہے کہ فقط ایک خاص علمی طبقہ وہ بھی صرف ریاضی اور فزکس کے ماہرین ہی کا اس سے تعلق ہے ۔ اور چونکہ وہ آئین سٹائن کی زبان کو بخوبی سمجھتے ہیں ۔ اس لیے وہ اسے مسخ نہیں کر سکتے یا اس میں تحریف و تبدیلی نہیں کر سکتے ۔ یعنی جن تھیوریوں اور فلسفوں کا تعلق ایک خاص طبقہ سے ہے اور وہ طبقہ بھی اس چیز میں مہارت کامل رکھتا ہو تو وہ تھیوری اور فلسفہ اسی دائرے میں رہتا ہے اور محفوظ رہتا ہے ۔ لیکن جو چیزیں کسی طبقہ میں گھری نہیں رہتیں ، کیونکہ انکا تعلق عوام اور پورے انسانی گروہ سے ہے ، وہاں یہ بیماری جسکا ذکر میں نے کیا اکثر آجاتی ہے اور اس بیماری کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ اس دین کی کسی اہم حقیقت کو غلط طریقہ سے سمجھا جائے یا پیش کیا جائے ۔ یہ ایک ایسی بیماری ہے کہ جو کسی بھی حقیقت کو نیست و نابود کر سکتی ہے کیونکہ عوام اپنی سمجھ کے مطابق (وہ بھی بہت پست فکر کے ساتھ) اس کو اپنے ذہن میں لاتے ہیں اور پھر اپنی عادت اپنے سلیقے اور اپنی شخصیت ذہنیت کے اعتبار اسے اسی رنگ میں لا کر اس حقیقت کو اپنے اصل مرکز سے بہت دور کر دیتے ہیں ۔

میں مثال کے طور پہ ایک چیز عرض کرتا ہوں ، کہ آپ دیکھ سکیں کہ حقائق کس طرح عوامیت کا شکار ہوتے ہیں ۔ مثلاً ہمارے مذہب کی جو اہم اور مقدس شخصیات ہیں ان کی معرفت ہم ایک انسان کی انچ

اصلیت و واقفیت کو پورے طور سے نہیں درک کر پاتے مثلاً ہم مولائے کائنات کے بارے میں پر نہیں جانتے۔ کہ کیوں وہ اہم ہیں؟ بس یہ جانتے ہیں کہ وہ بہت اہم ہیں۔ ہم کو معلوم ہے کہ عظیم ہیں ہماری ان سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ "ہم خاکؔ عالم پاک"

اس لیے ہم ان کی محبت میں سرشار ہیں ان کی الفت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ لیکن وہ کیوں اہمیت رکھتے ہیں؟ ان کی شخصیت کیوں اتنی بلند و بالا ہے؟ .... ہم اس سے نا آشنا ہیں۔ وہ معیار وہ کسوٹی جو مولائے کائنات نے ہمیں دی تھی جو معیار اسلام نے عطا کیا تھا۔ اس کو کام میں نہیں لاتے کیوں؟

اس لئے کہ ہمیں اس اسلامی معیار یا مولائے کائنات کے بتائے ہوئے راستے کا پتہ ہی نہیں۔

ہم صرف پرانی عادات اور وراثت میں ملی ہوئی علمیت جو نسل در نسل ہم تک چلی آرہی ہے۔ اس کے ذریعے مولائے کائنات کو پہچانتے ہیں۔ ان کے تمام فضائل و کرامات کو ہم صرف معجزات و کرامات پر منحصر کر دیتے ہیں۔ فقط ان کے معجزات و کرامات کی جستجو میں ہیں یا اس پر سر دھنتے ہیں۔ مثلاً جب آپ گہوارے میں تھے تو ایک اژدھا آیا تھا۔ آپ نے ننھے ننھے ہاتھ گہوارے میں سے نکالے اور اژدھے کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ اس لئے مولائے کائنات بہت عظیم ہیں۔ ہمیں اس روایت سے سروکار نہیں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب وہ امام ہیں یعنی اگر ان کی پیروی کی جائے تو ہم نجات پا جائیں گے۔ وہ ہمارے رہنما ہیں، ہمارے

رہبر ہیں یعنی ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنا چاہیئے تاکہ ہم ایک اچھا سماج، ایک آزاد معاشرہ اور ایک کامیاب تہذیب سے ہمکنار ہو سکیں لیکن ہم اس بچے کی پیروی کس طرح کریں جس نے گہوارے میں اژدھے کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی سماج و معاشرہ اس شخص کی تقلید کرے جو محیر العقول کام انجام دیتا ہے، آخر کیسے انجام دے اور پھر وہ ترقی بھی کر جائے یہ کیسے ممکن ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا۔

یہ صحیح ہے کہ مولائے کائنات نے اس طرح کے معجزات بھی دکھائے لیکن ہم اس کی تعریف کر کے کس طرح پیروی کریں اور کس طرح آگے بڑھ سکیں گے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟ صرف اس لئے کہ ہزاروں سال سے مذہبی نظریہ یہ تھا کہ دنیائے خاکی جس میں ہم رہتے ہیں، پست ہے، معمول ہے اور سب سے کمتر ہے۔ اس کے اوپر بھی چند افلاک ہیں جو زمین سے زیادہ اہمیت والے ہیں اور افلاک جیسے جیسے اوپر واقع ہوتے ہیں۔ اسی حساب سے ان کے درجات بلند ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس ملک کی باری آتی ہے جو فرشتوں کا مسکن ہے جو زمین سے بہت زیادہ بلند درجہ رکھتا ہے اور انسان سے کہیں زیادہ مرتبے والا ہے۔ پھر فرشتوں کے آسمان سے اوپر وہ فلک ہے جو خداؤں کا مسکن ہے۔ یہ وہ تعلیم ہے جو ہزاروں سال سے مختلف مذاہب دے رہے تھے اور ہم اس کے قائل تھے۔

اس نظریہ کے مطابق انسان سب سے زیادہ پست ہے۔ اس کے بعد فرشتوں کا نمبر ہے اور پھر خدا یا خداؤں کی منزل ہے۔ یہ طرزِ فکر اور یہ نظریہ جب اسلام میں داخل ہوتا ہے تو ہم اسلام کو اور معلمانِ کائنات کو بلکہ تمام بانیانِ مذاہب کو اسی غیر اسلامی نظریئے کے تحت دیکھتے ہیں اور پھر ان کی عظمت کے قائل ہوتے ہیں اور ان کی تعریف و توصیف میں مشغول ہو جاتے ہیں اور اس سے کوئی ثمرہ ہمیں نہیں ملتا۔

میرے اساتذہ میں جناب گوروچ جو مشہور ماہر سماجیات ہیں، کہتے ہیں کہ ۷۰ سال علم اجتماع میں STRUCTUALISM کے نظریئے کی سخت مخالفت اور جم کر مقابلہ کیا اور اس کے بعد جب میں نے لاروس کی ایک کتاب پڑھی جس میں میری زندگی اور کارناموں سے بحث کی گئی تھی تو اس میں وہ رقم طراز تھا کہ جناب گوروچ دنیا کے ماہر سماجیات ہیں اور وہ STRUCTUALISM کے نظریئے کے بانیوں میں تھے۔ یہ ہے ہماری ۷۰ سال محنت کا صلہ۔ اب اس بات کو لکھنے کے بعد وہ چاہے جتنی تعریف کرے۔ چاہے جتنا ان کو عظیم بتائے جس قدر بھی انہیں ماہر سماجیات بتائے جس قدر بھی ان کی خدمات کا اعتراف کرے کوئی فائدہ نہیں کیونکہ ان کے اصل نظریئے کو ختم کر دیا۔

اسلام میں خلقتِ انسان کے بارے میں ملتا ہے کہ خداوندِ عالم نے بہت واضح طور پر اپنی امانت کو زمین، پہاڑ، فرشتوں حتیٰ کہ مقرب فرشتوں کے سامنے پیش کیا لیکن کوئی اس امانت کے بوجھ کو اٹھانے پر

تیار نہ ہوا۔ صرف انسان تھا جو آگے بڑھا اور وہ اس عظیم منصب کو لینے پر تیار ہو گیا۔

تو پھر خداوند عالم نے تمام فرشتوں کو حکم دیا کہ سب اس عظیم مخلوق کو سجدہ کریں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان فرشتوں کا مسجود رہ چکا ہے۔ بلند درجہ رکھتا ہے۔ آدمیت، بشریت اور انسانیت فرشتوں سے اعلیٰ و اشرف ہے۔

اس لیے اگر ہم اسلام کی روشنی میں غور کریں اور مولائے کائنات کو اس عنوان کے تحت دیکھیں کہ ایک مسلمان، ایک پیرو اپنے امام کے لیے کیا کہتا ہے اور اسلامی نقطۂ نظر سے مولائے کائنات کے بارے میں کچھ کہا گیا تو ہمیں فضائل تلاش کرنا ہوں گے جو ایک انسان میں ہونے چاہئیں، وہ انسان جو مسجودِ ملائکہ ہے۔ وہ انسان جو مقرب فرشتوں سے بھی برتر ہے۔ مگر افسوس . . . . ہم میں یہ ادراک نہیں ہے۔ یہ طرزِ فکر ابھی تک ہمارے ذہنوں میں جگہ نہ پا سکا۔ اسی وجہ سے جب ہم اپنے آئمہ اور انبیاء کی تعریف و توصیف کرتے ہیں تو ان کو فرشتہ صفت کہتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اس طرح ہم نے امام کو فرشتوں کی منزل پہ پہنچا دیا اور ان کو ہم انسانیت کی منزل سے بہت اوپر لے آئے۔ درآں حالیکہ حقیقت میں فرشتوں کے برابر لا کر ہم نے انکی منزلت کو کم کیا ہے۔ اگر ہم ان کی نسبت اور تمام وہ صفات جو فرشتوں کے لیے ہیں۔ نے آئمہ کی طرف دی اور ان کو مقرب فرشتوں کی منزل پہ لا کر رکھیں

تو قرآن کی روشنی میں ہم نے ان کے مرتبے کو آدمیت اور انسانیت سے کم کر دیا ہے۔ پیغمبر اسلام کی یہ فضیلت نہیں ہے کہ ان کا سایہ نہ تھا کیونکہ روح کا سایہ نہیں ہوتا، فرشتوں کا سایہ نہیں ہوتا۔ بہت سی مخلوقات ہیں جن کا سایہ نہیں ہے تو یہ پیغمبر کی فضیلت نہیں ہوئی اور اسی طرح اس قسم کی باتیں مولائے کائنات میں ہوں تو علیؑ کی تعریف فرشتوں کے برابر ہو جائے گی جبکہ مولائے کائنات کی منزل فرشتوں سے بہت بلند ہے۔ وہ تو مسجود ملائکہ ہیں۔

اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ان میں انسانیت کے کمال کو تلاش کریں نہ کہ فرشتوں کی صفات کو لیکن اب تک ہمارا طرز فکر غیر اسلامی ہے بلکہ یہ طرز فکر اسلام سے پہلے کا ہے۔ اس کے تحت ہم علیؑ کو دیکھتے ہیں اور پھر علیؑ اور اپنے دوسرے رہبروں کو فرشتہ ثابت کرتے ہیں جس کا رہبری سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ فرشتوں کی پیروی نہیں ہو سکتی اور فرشتہ انسانی معاشرے کو نجات عطا نہیں کر سکتا یہ صرف عظیم انسان کا کمال ہے کہ وہ انسانیت کو نجات بخش سکتا ہے۔ وہ عظیم انسان کوئی اور نہیں علیؑ ہے علیؑ ہے علیؑ۔

لیکن مولائے کائنات کے انسانی کمالات کیا ہیں۔ وہ مسئلہ جس کے بارے میں شاید اب تک سوچا ہی نہیں گیا جب کہ یہ سب سے ضروری تھی وہ موجودہ کائنات کی تنہائی، یوں تو ہر انسان ایک تنہا مخلوق ہے۔ تمام قصوں، کہانیوں میں، تمام پرانی الف لیلوی داستانوں میں تمام مذاہب میں انسانیت کی پوری تاریخ میں مختلف طریقوں سے مختلف زبانوں میں یہ کہا

گیا ہے کہ انسان کی سب سے بڑی مصیبت اس کی تنہائی ہے ..... یہ تنہائی کیوں ؟

" اریک فرزم " کا کہنا ہے کہ تنہائی عشق، بیگانگی کی پیداوار ہے۔ بالکل صحیح بات یہ ہے کیونکہ جو شخص اپنے معبود، اپنے معشوق کے عشق میں مبتلا ہے۔ وہ دوسری تمام چیزوں سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سے اب کسی اور کی آرزو نہیں۔ جب نہ ہو تو تنہا رہ جاتا ہے۔ جو شخص لوگوں سے اور تمام چیزوں سے بیگانہ ہے، کسی سے اُنس نہیں ہے، کسی سے مطابقت نہیں ہے تو وہ تنہا رہ جاتا ہے۔ اسے تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔

انسان جیسے جیسے "انسان" ہونے لگتا ہے۔ اسے اپنی تنہائی کا زیادہ احساس ہونے لگتا ہے۔ عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ گہرے ہوتے ہیں یا جو انسانیت کے ممتاز افراد ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں کی ہوس و لذت کو دیکھ کر رنجیدہ ہوتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں یا وہ لوگ جو رفتہ رفتہ انسانی بلندیوں کی طرف قدم بڑھاتے ہیں وہ رفتہ رفتہ معاشرے سے دور ہوتے رہتے ہیں اور اکیلے رہ جاتے ہیں

دنیا کی اہم علمی شخصیات کو اگر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے وقت اور زمانہ میں تنہا تھیں یا خود اپنے دور میں غیر معروف تھیں، اجنبی تھیں، خود اپنے وطن میں بیگانہ تھیں اور ان کو ...... ان کی باتوں کو .... ان کی تحقیقات کو .... اور ان کے طرزِ فکر اور سطحِ فکر کو انکے بعد والوں نے زیادہ بہتر سمجھا۔

ہر فلسفہ اور طرزِ فکر میں انسان تنہا نظر آتا ہے۔ انہیں تنہائی کی مصیبت کو برداشت کرتا نظر آتا ہے اور جیسے جیسے انسان اپنی انسانیت کی منزل کو طے کرتا چلا جاتا ہے۔ اپنے گرد و پیش سے اجنبی ہوتا جاتا ہے زندگی کے ہنگاموں سے الگ ہوتا جاتا ہے اور تنہا ہوتا چلا جاتا ہے

جن وجہوں سے انسان معاشرہ سے کٹ جاتا ہے۔ ان میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ وہ ان چیزوں سے بیگانہ ہو جاتا ہے جس کی طرف عام طور پر رغبت ہوتی ہے۔ اس کی وہ پیاس جو دوسروں کو ایک چشمہ سے سیراب ہوتا دیکھتی ہے لیکن خود ادھر مائل نہیں ہوتی۔ اس کی بھوک، لوگوں کو ایک دسترخوان پر آزادی سے کھاتا ہوا دیکھتی ہے لیکن خود ادھر مائل نہیں ہوتی جیسے جیسے روح بلندیوں کی طرف بڑھتی ہے۔ اور عظمتوں کو حاصل کرتی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ عظمت جس کو قرآن قصۂ آدم کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ بالکل تنہا ہو چکی ہوتی۔

دنیا میں کون تنہا نہیں؟ .... وہ شخص تنہا نہیں ہے جو سب کے ساتھ ہے یعنی سب کی سطحِ فکر میں مساوی ہے۔ سب کے اندازِ فکر سے سوچتا ہے اور سب کے انداز سے دیکھتا ہے۔ یعنی وہ جو زمانے کے رنگ میں رنگ جاتا ہے اور پھر وہ ان ہی کے رنگ میں، ان ہی کے انداز میں، ان ہی کی سطح پر سوچتا ہے، دیکھتا ہے، سنتا ہے اور پھر ہر چیز میں ان کے ساتھ ہو کر ان ہی میں سے ایک ہو جاتا ہے۔ یہ انسان پھر کبھی تنہائی کا احساس نہیں کرتا۔ کیوں؟ .... کہ سب کی طرح سے ہے ..... ان ہی میں سے ایک ہے۔ وہ ان ہی

کے ساتھ ہے... سب کے ساتھ کھاتا پیتا ہے.... سب کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے اور ان کے لذات سے بہرہ اندوز ہوتا ہے

اجنبیت اور تنہائی کا احساس تو اس کو ہوتا ہے جو اپنے معاشرے کی اور اپنے زمانے کی برائیوں کو دیکھتا ہے، اسے محسوس کرتا ہے اور پھر اس سے اجتناب کرکے پھر تنہا رہ جاتا ہے اور یہی اجتناب اور احساس تنہائی اپنے ماحول سے اپنی دنیا سے کھینچ کر اسے اس کی طرف لے جاتا ہے جس کی وہ پرستش کرتا ہے جہاں اس کے احساسات کو سکون ملتا ہے وہ جگہ جو اس کے لئے مناسب ہے۔ وہ منزل جو اس کی شخصیت کے لائق ہے۔

یہی احساس روح کے کامل ہونے کے ساتھ بڑھتا رہتا ہے شدید تر ہو جاتا ہے اور اس اعتبار سے تکلیف میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ انسان کے لئے سب سے دردناک چیز د وہ انسان جو بلندیوں تک پہنچ چکا ہے، تنہائی ہے۔

ہم مولائے کائنات کی زندگی میں دیکھتے ہیں جس حد تک بھی ہماری معرفت ہے کہ وہی مولائے کائنات نالۂ نیم شبی میں مشغول ہیں، فریاد کناں ہیں، ان کی خاموشی دیکھ کر دل ڈوبنے لگتا ہے۔ ان کی باتیں سن کر دل میں ایک درد سا اٹھتا ہے کیونکہ یہ وہی علیؑ ہیں جنہوں نے مدتوں تلوار چلائی، جنگیں کیں، قربانیاں دیں اور اس کے بعد جب اپنی بے پناہ کوشش اور قربانیوں سے ایک جدید معاشرے کی بنیاد ڈالی، لوگوں کو ایک نئی زندگی دی اور اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے تو خود اپنے ہی ساتھیوں میں تنہا ہیں، خود اپنے ہی لوگوں میں اجنبی ہیں۔ صرف یہی نہیں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ رات کی

تاریکی میں شہر سے باہر نکلتے ہیں۔ صحرا کے کسی کنوئیں میں منہ ڈال کر حال دل کہتے ہیں، آنسو بہاتے ہیں۔ پھر خاموشی سے "اجنبیوں" میں آملتے ہیں کسی لکھنے والے نے لکھا کہ، شیر دن میں نہیں روتا.... لومڑیوں کے سامنے .... بھیڑیوں کے سامنے .... عام جانوروں کے سامنے .... شیر آنسو نہیں بہاتا۔ ان کے سامنے اپنے وقار کو اپنی عظمت کو خاموشی کی چادر میں لپیٹے رہتا ہے۔ اپنے ناقابل برداشت درد کو بھی چھپائے رہتا ہے لیکن .... جب رات کی تاریکی پھیل جاتی ہے، جب اندھیرا ساری کائنات پر چھا جاتا ہے تو وہ .... تنہا .... اس وقت صبر کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔ تو اندھیری تاریک رات میں وہ جنگلوں، صحراؤں میں .... ایسی جگہ جہاں کوئی نہ ہو .... جس وقت لوگ اپنے گھروں میں آرام سے سو رہے ہوں!.... کوئی تکلیف، کوئی مصیبت کوئی فکر ان کے لئے باعث بیداری نہ ہو .... اس وقت یہ تنہا .... جو پوری کائنات میں اپنے کو تنہا محسوس کر رہا ہے .... یہ زمین، یہ آسمان سب اس کے لئے اجنبی ہیں .... اگر اس کا کوئی ساتھی ہے، کوئی غمخوار ہے، کوئی ہمدم ہے تو صرف اور صرف اس کا احساس ذمہ داری .... جو اسے اس معاشرہ سے منسلک کئے ہوئے ہے .... اس کی امامت ہے جو لوگوں سے ملنے پر مجبور کرتی ہے .... ورنہ جب وہ اپنے چاروں طرف دیکھتا ہے تو پھر وہی نظر آتا ہے اور یہ تنہا ہے .... تنہا ہے .... پھر تنہائی کی تلاش کرتا ہے اور پھر آبادیوں سے دور، ان اجنبیوں سے دور بہت دور کسی تاریک کنوئیں میں منہ ڈال کر اپنا حال دل کہتا ہے۔ صرف اس لئے کہ اس کی یہ فریاد اس کی سرد آہیں، کسی پست فطرت اور کم ظرف کے کانوں تک نہ پہنچیں

مولائے کائنات اس طرح احساس تنہائی کرتے ہیں جیسے کہ انسانیت تنہائی محسوس کرتی ہے جس طرح کہ مختلف نظریات نے اس کو بیان کیا ہے۔ میں یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس احساس تنہائی کے بارے میں اگر تمام مذاہب نہیں تو اکثر مذاہب اس کے معتقد نظر آئیں گے اور دین و مذہب سے بیگانہ، سارتر بھی یہی کہتا نظر آتا ہے۔ وہ انسان کو ایک الگ، ایک جدا مخلوق فرض کرتا ہے۔ اسکا کہنا ہے کہ تمام کائنات ایک طرح سے بنائی گئی ہے یعنی پہلے ان کی ماہیت اور بعد میں ان کا وجود... سوائے انسان کے.... کیونکہ یہاں اسکے برعکس ہے پہلے اسکا وجود، بعد میں ماہیت۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سارتر جو خدا اور مذاہب پر ایمان نہیں رکھتا، وہ بھی یہی کہتا ہے کہ انسان ایک ایسا عنصر ہے جو پوری مادی کائنات سے جدا ہے اور اجنبی اور بیگانہ... اور انسان حیوانیت اور خواہشات جو اسکی فطرت سے ملے ہیں جس رفتار سے دور ہوتا جاتا ہے تو وہ تنہا ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ جب صرف انسان رہ جاتا ہے تو سب سے الگ، سب سے جدا.... اور مولائے کائنات ایک انسان مطلق ہیں....

مولائے کائنات انسانیت کی پوری تاریخ میں ایک ایسی شخصیت ہیں جس میں مختلف بلکہ متضاد چیزیں جمع ہو گئی تھیں۔ کبھی وہ ایک عام مزدور کی طرح نظر آتے ہیں کہ اپنے ہاتھوں سے اپنے بازوؤں سے مٹی کھود رہے ہیں، تپش ہوتی ہے چلچلاتی دھوپ ہے مگر وہ کام میں مشغول ہیں اور پھر کبھی فلسفی کے روپ میں سوچتے نظر آتے ہیں.... کبھی اپنے خالق کی یاد میں کسی پہنچے ہوئے عارف کی طرح دریائے معرفت میں غوطہ زن ہیں.... تو کبھی بہادر جنگجو کی طرح تلوار لے کر میدان میں نظر آتے ہیں.... کبھی ایک سیاستدان کی طرح ملک و قوم کی راہنمائی کرتے نظر آتے ہیں..... تو کبھی معلم اخلاق، فضائل انسانی

کا سرچشمہ نظر آتے ہیں .... وہاں باپ بھی ہیں .... اور وفادار دوست بھی ہیں .... بے مثال شوہر بھی ہیں .....

اس اہم نکتہ کو کوئی مورخ یا سماجیات کا ماہر نہیں سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے مولائے کائنات کی تنہائی کا باعث ان کی پیغمبر اسلام سے رشتہ داری بھی ہے۔ اگر وہ آج ان کے خاندان میں نہ ہوتے تو شاید اتنی مخالفت نہ ہوتی .... یہ وہ شخصیت ہے جس کو مدینہ کے معاشرے سے کوئی ربط نہ تھا .... لیکن حق کے لئے جو معرکے کئے تھے .... تکلیفیں اٹھائی تھیں .... رنج و مصائب جھیلے تھے .... آج وہی تلوار، وہی جنگیں، وہی معرکے اس کو سب سے الگ کرنے پہ تلے ہوئے ہیں۔ اس لئے آج بھی مدینہ میں تنہا ہیں اور اس سے بھی بڑی مصیبت اور تکلیف وہ بات یہ ہے کہ مولائے کائنات خود اپنے چاہنے والوں کے درمیان تنہا ہیں۔ اپنی اس قوم کے درمیان جس نے اپنی پوری محبت الفت، تاریخ، تعلیم سب ان کے سپرد کر دی ہے۔ اسی قوم میں علی تنہا ہیں

ختم شد

جب آلام روزگار مجھے مایوس اور ناکامیاں مجھے عاجز کر دیتی ہیں، تو ایسی تاریکیوں میں امیرالمومنینؑ کے اقوال، ان کے خطبات اور ان کی ادعیہ (دعائیں) مجھے ٹھوکر کھا کر گرنے سے بچا لیتے ہیں یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ آپ بھی آزما لیجئے۔

امیرالمومنین حضرت امام علی ابن طالب علیہ السلام کی ذات گرامی تمام امت مسلمہ کے لئے یکساں کعبۂ مقصود ہے اگر آپ شیعہ ہیں تو آپ انہیں اپنا امام اول تسلیم کرتے ہیں اس لئے ان کے اقوال آپ کے لئے رہنما ہیں اور اگر آپ حنفی، شافعی، مالکی، یا حنبلی ہیں تو آپ انہیں اپنا چوتھا خلیفۂ راشد تسلیم کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے اقوال آپ کے واسطے رہنما ہیں۔

ماخوذ از کتاب "ثقلین" تالیف مولانا مرزا محمد جعفر
مرسلہ: ارجمند کاظمی (جامعہ کراچی)

علم و آگہی

اسلام کی محکم تعلیمات

رشد و فلاح کا راستہ ہموار کرتی ہیں اور اس راستے پر چلنے والوں کی
دنیوی و اخروی نجات کی ضامن ہیں۔

رسالت	سب کے لیے
تحریم	خواتین کے لیے
اُجالا	بچوں کے لیے

زیر ادارت:
سید محمد علی

بہت جلد انشاء اللہ العزیز

mobilib.org

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب سید مرتضیٰ حسین فاضل ؒ

نہج البلاغہ کا ادبی مقام

ہر بڑا انقلاب ماضی کو گہرے غبار اور تاریک پردوں میں چھپا دیتا ہے، اور جب تک وہ انقلاب اپنے توانا نتائج کے ساتھ برقرار رہتا ہے اس وقت تک قوم، افراد، ماحول اور ثقافت میں تاثیر کی قوت و زندگی رہتی ہے، پھر یہ قوت نئی توانائیوں کا سرچشمہ بن کر نئے ادب، نئی تہذیب، نئے تصورات بلکہ نئی نسل پیدا کرتی ہے۔

تاریخِ عالم میں اسلام ایک حیات آفرین انقلاب تھا جس نے ماضی کو فراموش کرا دیا، مختلف قوموں کے بنائے ہوئے لات و ہبل توڑ دیئے، افراد کی انفرادی توانائی ماننے سے انکار کر دیا، لاقانونی کو فنا کر کے اس عہد کے کلچر، ثقافت، فرہنگ و تاثرات کو جہل قرار دیا، ایک مضبوط قانون، معیاری کردار اور آسمانی خیالات، عقائد و ثقافت کی ترویج شروع کی، چنانچہ دس برس کے اندر اندر ماحول و اذہان بدل گئے، میلے ختم ہو گئے، چھوٹی چھوٹی خانہ جنگیاں قبائلی نظام اور رسم و رواج ختم کر دیئے، بڑے بڑے شاعروں، کاہنوں، خطیبوں، اور ادیبوں کو خاموش کر دیا، اس انقلاب کا آئین قرآنِ مجید تھا، اس انقلاب کا آسمانی زعیم آخری نبی محمدِ مصطفیٰ ؐ کا وجودِ ذی جود تھا، ہر ہوش مند صاحبِ عقل نے ان دونوں غیر معمولی معجزوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے، قصیدہ گو شعراء نے لن ترانیاں چھوڑ دیں، قصیدے کے رنگ اکھڑ گئے، کاہنوں کی علاقائی و اشاراتی نثروں کے سننے اور یاد کرنے والے کم ہو گئے، مقررین نے پیغمبرِ اکرم کے سامنے بولنا چھوڑ دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جو ذاتی ادب سکۂ رائج کی طرح

جل رہا تھا وہ ناپید ہو گیا، آج اس ادب کے محقق کو گنتی کے شاعر اور تھوڑے سے منتشر یا مشتبہ ادب کے علاوہ کچھ نہیں ملتا، اور پھر اس میں بھی نظم ہی نظم ہے، نثر برائے نام ہے۔

سنہ بعثت سے سنہ ۱۱ھ تک جو ادب پیدا ہوا وہ قرآن و حدیث ہے، انقلابی تحریک یعنی اسلام کے پرستاروں نے ان دونوں چیزوں کے ہوتے ہوئے کسی ادب کی ضرورت محسوس نہ کی یا کوئی ایسا موقع نہ پایا کہ خود بھی کچھ لکھتے یا بولتے، لڑائیوں میں البتہ رجز خوانیاں تو ہوتی تھیں، لیکن خطبوں اور تقریروں کے مواقع یا آتے نہیں، یا کسی نے تقریر کی نہیں، کیوں کہ یہ ضرورتیں وحی یا صاحبِ وحی کے ہاتھوں انجام پاتی تھیں، نامور شعرا اپنے قدیم تجربوں کی بنا پر نئے ماحول میں اپنے اسلوب پر نئے خیالات بیان کرتے تھے، جن میں کوئی زیادہ تاثیر و کشش نہیں تھی، صرف یہ ہوتا تھا کہ وقتی تقاضے پورے ہو جاتے تھے۔

قرآنِ مجید اور احادیث کی نثر روزمرہ کے معاملات میں کارآمد ہونے کے علاوہ ادب کی اُن عظیم قدروں سے ہمکنار رہتی تھی کہ لوگ شعر سے غافل ہو گئے تھے، ادھر قرآن نے اس تحریک کے زعیم کے لئے فرمایا کہ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِيْ لَهٗ "ہم نے اپنے نبیؐ کو نہ شعر کی تعلیم دی نہ یہ فن اُن کے لئے مناسب ہے"۔ پھر اس ماحول کے شاعروں کے لئے کہا۔ اَلشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ: "شعراء کے پیچھے رہنے والے گمراہ ہیں"۔ رسول اللہؐ نے اس تفسیر میں اس دور کی شاعری کو بہت زیادہ قابلِ مذمت بتایا۔ چنانچہ ادب برائے ادب اور ادب برائے تفریح ترک ہو گئی۔

سنہ ۱۱ھ کے بعد ایک تو وحی کا دروازہ بند ہو گیا، دوسرے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے فرمودات کا تسلسل نہ رہا، اس لئے سرکاری کاروبار، عوامی ضروریات اور قانونی تفصیلات کے لئے نظم و نثر کی ضرورتیں مسلمانوں کی زبان و قلم سے پوری ہونے لگیں،

مگر نفسیاتی تاثیر اور قدرتی اثر کی وجہ سے ہر شخص قرآن اور حدیث کے اسلوب پر لکھنے اور بولنے کی کوشش کرتا ہوگا۔ ہمارے سامنے اس دور کا عربی مواد محفوظ طریقے پر نہیں پہنچا، اور اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو اس دور میں کوئی ادب جسے ادب کہا جا سکے پیدا ہی نہیں ہوا، میں جانتا ہوں کہ اس وقت خطوط نگاری، شاعری اور تقریر زندہ تھی، مگر ان چیزوں میں اتنی جان نہ تھی کہ مورخین و ادبا انھیں یاد رکھنے پر مجبور ہو جاتے، ادب جاہلیت کا چرچا تھا، مگر اسکے متوازی ادب پیدا کرنے کے لئے نہیں بلکہ قرآن و حدیث کے نکات سمجھنے، سمجھانے کے لئے اور بس۔

عین اس ذہنی افلاس اور ادبی جمود میں فرزندِ ابوطالب، پروردۂ رسولؐ، مجاہدِ اوّل، داعیِ انقلاب و اسلام کا قدیم ترین اور سب سے پہلا ساتھی علی ابن ابیطالبؑ شہرِ حکمت کا دروازہ: آیاتِ قرآن کا حافظِ اوّل، کلامِ خدا کا پُرخلوص جامع و مفسّر، احادیثِ نبوی کا پہلا مؤلف و مرتب، میدانوں کا رجز خواں، دعوتِ دین کا پہلا مبلغ و مقرر، مکہ اور مدینہ میں آیات و فرامینِ نبیؐ بیان کرنے والا، دشمنوں کے سامنے سورۂ برأت اور دوستوں کے سامنے تفسیر و تشریحِ قرآن و حدیث کرنے والا نظم و نثر کے دریا بہا رہا تھا، اس کی نظم روایتی شاعروں کی طرح مقامی قصوں اور میدانِ جنگ کے جوش آفرین جذبات پر مشتمل نہ تھی، بلکہ اس میں ادب برائے زندگی کی روح تھی، اسلام کے مقصد کا پرچار تھا، خدائے بزرگ و برتر کی عظمت کا اعلان، دنیا اور اسلام کا رشتہ، اخلاق و مواعظ کا حکیمانہ تصور تھا، اسکی گفتگو قریش کی روایتی عظمت، قرآن و حدیث کی جلالت و شانِ اعجاز اپنے جلو میں لئے تھی، رزم میں رجز، غم میں مرثیے، عبرت خیز اشعار، نصیحت بخش قطعات، قدرے طویل مناجاتیں، یہ نظمیں حضرت علیؑ نے خود تحریر فرمائیں۔

مسندِ درس پر قرآن کی تفسیر، حدیث کی تشریح، احکام کی تفصیل بیان فرمائی، کرسیِ عدالت پر مقدموں کے فیصلے لکھے اور سنائے، بزم میں سنت و سیرتِ نبی کے واقعات بیان کیے، دوست اور دشمنوں کو خط لکھے، عہد نامے اور صلح نامے قلمبند فرمائے اور منبرِ رسولؐ اور پشتِ فرس، میدانِ رزم، مسجدِ عبادت میں تقریریں فرمائیں۔ غرض اپنی مصروف ترین زندگی میں وہ سب کچھ کیا جو حضرتِ محمدِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا کرتے تھے

تقریر و تحریر، نظم و نثر، تالیف و تصانیف، سیرت و کردار میں اتنی دلربائی، اتنی قدرت و کشش کہ اسلوبِ قرآن پیشِ نظر رکھنے والے اصحاب و تابعین، کلامِ رسولؐ سننے والے کان اور دماغ اِن باتوں کو قلمبند، محفوظ اور نقل کرنے پر مجبور ہو گئے، کیوں کہ حضرتِ امیرؑ کا شعور، ذوق اور ادب انھیں معجزوں کا آئینہ دار تھا، وہی زبان، وہی خیال، وہی اسلوب، وہی انداز، اُسی رنگ کی عبارت، اُسی ڈھنگ کا مطلب، وہی بیباکانہ اعلانِ حقیقت، وہی آسمانی پیغام کا پرچار اپنے دامن میں لیے تھا جو آنحضرتؐ انھیں سکھا گئے تھے۔

مدینے کی تحریریں اور تقریریں لوگوں نے سنیں اور پڑھیں، فیضِ ہم نشینی، شرفِ ہم رکابی حاصل کیا، کوفے میں آکے تو یہاں کا ماحول مدینے سے مختلف تھا، یہاں کی ضرورتیں وہاں سے جداگانہ تھیں، وہاں گھر میں بیٹھ کے جانے بوجھے لوگوں میں گفتگو کرنا ہوتی تھی، مختصر مختصر تقریریں، چھوٹے چھوٹے خط، ایک ایک جملہ کا موعظہ ہوتا ہوگا، لوگوں کو بھولی باتیں دہرا کر پچھلی یادیں دلاتے ہوں گے۔ منبر پر غیروں کا قبضہ تھا، میدانِ جنگ میں آنجانے کا اتفاق نہیں ہوا، کچھ مباحثے ہو گئے، کبھی کبھی بڑی تقریر کر دی ورنہ گھر میں بیٹھے درسِ قرآن و حدیث اور تبلیغ و تشریحِ احکام شغلہ تھا۔

کوفہ میں مجمع نیا تھا، لوگ بالکل جاہل تھے، سپاہی ڈھلمل یقین، شہری

غیر متمدن، مسلمان ناواقفِ حقائقِ اسلام، سمجھ دار لوگ شام کی تہذیبی خیالات سے متأثر، صحابۂ رسول، دنیا دار، واقف کار، ناواقف بن گئے۔ ادھر شامی ہنگامہ آرائی، مخالفین کا پروپیگنڈہ لوگوں کو گھبرا رہا تھا، جنابِ امیرؑ کو حقائقِ توحید، اصولِ اسلام، فروعی احکام، تشریحِ مسائل، دشمنوں کے جوابات، دوستوں کی ہمت افزائی، جنگی مسائل میں گفتگو اور عام خاص مجمعوں میں تقریریں کرنے کا زیادہ موقع ملا، نتیجہ یہ ہوا کہ کوفہ علم و ادب، مسائل و توحید و اسلام، فلسفی اور نفسیاتی تقریروں کا دارالعلوم بن گیا، اور ایسا شہر کہ جس میں مدینہ کے تیس سالہ تاریخ کے پہلے کی طرح صرف ایک بولنے والا معصوم رہنما تھا۔ سنہ ۱۱ھ سے پہلے مدینہ میں صرف ایک زبان تھی، جسے محمدؐ عربی کہتے ہیں، اور سنہ ۳۵ھ کے بعد کوفہ میں صرف ایک بولنے والا علی مرتضیٰؑ کہلایا۔

مگر وہ مدینے کے اکابر ہوں یا کوفہ اور دمشق کے سربرآوردہ دونوں نے دیکھ لیا کہ علی ابن ابیطالبؑ کا لہجہ، لہجۂ نبوی اور اسلوب و روحِ گفتگو آسمانی ہے، کوفہ تو خیر ایک نیا شہر تھا، دمشق جہاں امیرالمومنینؑ کے دشمن نمایاں برسوں سے حکومت کر رہے تھے، جہاں دور دراز کے فکر و صاحبانِ سیف و قلم بڑی بڑی تنخواہوں پر بلائے گئے تھے وہاں بھی کوئی ایسا انشاء پرداز نہ تھا جو بیک وقت نظم و نثر کی ضرورت کو پورا کرتا، دربار کے کلرک دو دو معاون ادیبوں کے ساتھ بیٹھ کر خط لکھتے تھے، میدانوں کے، نذرگیہ ناز و تکبر زبان آور آتے تھے، تقریریں کرتے تھے، مگر کیا؟ "نشستند و گفتند و برخاستند"

امیرالمومنینؑ تن تنہا نظم کا جواب نظم، نثر کا جواب نثر میں لکھتے تھے، تقریروں کا جواب تقریر سے دیتے تھے، اور اس شان سے کہ دوست اسے حفظ کرتے اور دشمن اسے لاجواب سمجھ کر دم بخود ہو جاتے تھے۔

اُس دور کے خطوط آج بھی محفوظ ہیں، مگر ۳۶ھ سے آج تک کسی ادیب نے حضرت علیؑ کے علاوہ کسی کی تحریر کو درخورِ توجہ جانا، اور نہ کوئی تحریر ادبی سند اور ثقافتی دستاویز بن سکی۔ زبیری حلیفوں کی تقریریں اور حضرتِ امیرؑ کے خطبے تو اُن کا مقابلہ تو مقابلہ کے موقع پر تذکرہ ہمت کرنا کور ذوقی کی علامت سمجھا گیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ادب کا سرچشمہ ہمہ گیر طبیعت، اور اتھاہ علم و حکمت، وجدان کا معیار اور نفسیات کا خلوص تھا، جہاں جذبات میں کھوٹ ہو، وہاں عبارت اُلجھ جاتی ہے، جہاں علم محدود ہو وہاں فن میں آفاقیت نصیب نہیں ہوتی، جب ادیب عبارت کی تکنیک اور مطالب کی سنجیدہ ترتیب سے ناواقف ہو تو قلم پارہ، ادب پارہ نہیں بننے پاتا۔

کوئی ادیب یا ادب پارہ ادب کا سرمایہ اس وقت بنتا ہے جب وہ اپنے ماحول میں رہتے ہوئے عام انسانوں سے بلند اور پھیلے ہوئے ادب کا اونچا ہو، ادب پارہ حقیقت کا ایک پرتو ہوتا ہے، جسے ادیب سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

دنیا کا ہر بڑا مفکر و سپاہی انسان بڑا ادیب ہوا کرتا ہے، افلاطون، ارسطو، نطشے یا ہیگل، نصیر الدین طوسی یا بوعلی سینا، فلسفیوں میں ادیب تھے، اور اگر گستاخی نہ ہو تو کہا جائے کہ حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضور سرورِ عالم علیہم السلام خداوندِ عالم کے بعد ادب کے سرمایہ دار تھے، حضرت موسیٰ کی تو دعا تھی کہ "وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي" (قرآن) "خدایا! میری زبان کو اتنی روانی عطا فرما کہ لوگ میری بات کی روح تک پہنچ سکیں" جبکہ ادب کی تعریف بھی یہی کی گئی ہے۔ "ادب یک نوع ابلاغ خیال یا استعمال فکری است کہ از ذہنے بذہن دیگری می شود" (سخن سنجی، از لطف علی صورتگر صفحہ ۱۶)

اور قرآن نے اپنے تعارف میں کہا ہے:-

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ" یہ کتاب اور اس کے مطالب عام لوگوں کے لئے توضیحات ہیں۔" اور شاید پیغمبرؐ نے فرمایا ہے کہ "اِنَّ الْبَیَانِ لَسِحْراً" بیان جادو آفریں چیز ہے۔ ان جلیل الشان ہستیوں کے ملفوظات دو وجوہ سے ادب بنتے ہیں: ایک تو الہام و تائید خداوندی کی وجہ سے اور یہ بنیاد اس ادب کو تقدس و عظمت، دینی اعزاز اور عام ادب سے امتیاز بخشتی ہے، دوسرے ان حضرات کا خلوص جو اپنی بے مثالی کی وجہ سے دل کو موہ لیتا ہے، یہ خلوص ہر ادب کی جان ہے، جب تک ادیب میں خلوص نہ ہوگا، ادب میں زندگی نہ ہوگی، غالب نے کیا خوب کہا ہے ؎

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

یہ دلِ گداختہ دو طرح کا ہوتا ہے، ایک وقتی ہیجان اور آنی تاثر، جیسے شاعر کا دل یا شعلۂ نفس مقرر کی طبیعت کا اشتعال، اسی گداخت یا انفعال سے پیدا شدہ ادب ہموار نہیں ہوتا، کوئی شعر نرم ہوتا ہے، کوئی گرم، کوئی تقریر بے مثال ہوتی ہے کوئی خطبہ بے جان، کوئی خطبہ دلکش ہوتا ہے کوئی قابلِ نظر انداز۔ ۔ ۔ ۔ لیکن جب تاثرِ فطرت کا خمیر گداختگی کسی مقصد آفریں وجہ سے ہو، ادیب کا ایک سوچا سمجھا پیام ہو تو اس میں ناہمواری کا نام و نشان نہیں آتا، ادیب جیسا خلوص رکھتا ہوگا، ادب اسی قدر با اثر اور دلکش ہوگا، خلاقِ حقیقت اور صاحبِ پیام اگر خود خداوندِ عالم ہے تو چونکہ اس کا خلوص نشیب و فراز سے ماوراء ہے اسی لئے اس کا کلام بھی اس قسم کے اختلاف سے کوسوں دور ہوگا، اس بات کو قرآن نے اپنے اعجاز کی دلیل بتایا ہے: "وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا" یہی کلام اگر خدا کے علاوہ کوئی اور کہتا تو تمہیں اس میں کافی اونچ نیچ اور ناہمواری نظر آتی۔ (قرآن)

امیر المومنینؑ کا شعور روحِ محمدی اور اخلاق سے اتنا متاثر تھا کہ لوگ حضرتؑ میں پیغمبرؐ کی تصویر، آنحضرتؐ کی زندگی اور اس معیار کا دل، خلوص اور مقصد دیکھتے تھے، اس عہد کے لوگ آپ کے سامنے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئے تھے، تمام شخصیتوں میں صرف علیؑ تھے جو بانگِ دہل فرماتے تھے: اِنَّا لَاُمَرَآءُ الْكَلَامِ "ہم ہیں ادب کے امیر۔ (نہج البلاغہ،

ان کا ہر نفس ذکرِ خدا سے آشنا، ان کی ہر ادا رنگِ اسلام سے رنگین، ان کا ہر عمل مقصد الٰہی سے ہم آہنگ تھا، چنانچہ وہ قرآن کو اپنی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے، ان کا دل ہی نہیں شعور دلا شعور کا ہر حصہ حافظ و محافظِ قرآن تھا، انھوں نے دیکھا کہ عرب قرآن کو غلط پڑھنے لگے ہیں، اور لفظ کا غلط تلفظ، ترکیب سے ناواقف، اشارات و مطالب کو بدل دیتی ہے، مسلمان کچھ دن بعد اس معجزے کو اعجاز کے درجے سے گرا نہ دیں، اس لئے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں اور ازاد احول سے فطری برتری اپنے خلوصِ دل گرفتگی کی بنا پر بے چین ہو گئے اور ضبطِ اسلوب، معرفتِ ترکیب، لفظوں کے دروبست کی لطافتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے قواعد کی تدوین فرمائی، اپنے صحابی اور شاگرد ابوالاسود دؤلی کو اصولِ علم نحو کی تعلیم دی اور فنِ نحو پہ بنیادی اصول و مسائل لکھوا کر، گرامر پر تقریر فرما کر عربی ادب فہمی کے مستقبل کو محفوظ فرما دیا۔

ظاہر ہے کہ کسی ادب کا محسنِ اعظم وہ ہے جو اس زبان کے قواعد و اصول مدوّن کر دے۔

امیر المومنینؑ کے احسانات کی نوعیت اصل میں دینی ہے، مگر ہمیں اس کا ادبی زاویۂ نگاہ سے بھی جائزہ لینا ہے، اس لئے دونوں بیان کردہ احسان دینی طور پر جو عظمت رکھتے ہیں اس کے لئے اس سے زیادہ کچھ کہنا لفظوں کی بساط سے باہر ہے کہ

ایک غیر شخص کے لئے جو ادبِ عرب کی عظمت کا قائل ہے، جس کے نزدیک عربی زبان ایک عظیم زندہ زبان ہے، جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ عربی میں اتنی صلاحیت ہے کہ دنیا

اپنائے، اس کے لئے بھی یہ دونوں باتیں اتنی اہم ہیں کہ، اگر یہ اقدام نہ کیا جاتا تو عربی ادب تو کیا خود عربی زبان تک فنا ہو چکی ہوتی۔

علی ابن ابیطالبؑ وہ عظیم محسنِ عربی ہیں جن کی نگاہِ فیض اثر چشمہ آبِ حیات کا کام کر گئی۔ حضرتؑ نے کوفہ اور بصرہ کی فوجی چھاؤنی میں رہنے والے عرب سپاہیوں، جاہل آوارہ گرد آدمیوں کو تعلیم و اصول دے کر معلمینِ ادب کا درجہ دیدیا، کوفہ و بصرہ کی آنے والی نسلوں کے لئے چراغِ ادب بن گئے، ادب کے تمام اصناف قرآن کی قرأت، قرآن کی عظمت اور اس کا ادب انھیں دو شہروں سے پھیلا، اور آج تک قواعدِ ادب، فصاحت و بلاغت اور اسالیبِ کلام، نقد و لغت کے نکتے انھیں ماخذ سے ملتے ہیں۔

تفسیر قرآن و تدوین تعلیم و قواعدِ ادب کے علاوہ جناب امیرؑ نے ایک احسانِ عظیم یہ بھی فرمایا کہ جو کچھ لکھا، جب بھی بولے اس میں قرآن کو اپنایا، وہی لب لہجہ، وہی اسلوبِ خیال، وہی زندگی کے حقائق، وہی اخلاق کی تدریس، وہی حقیقت آفرینی، وہی انسانی رجحانات، اور وہی آسمانی پیغام پیش کیا، جسے قرآن لایا تھا، یعنی کتابِ خدا کو اتنی بار دہرایا کہ سننے والوں کے مذاق اس کے علاوہ سب کچھ بھول گئے، ادب یا قرآن و حدیث یاد کی جاتی تھی یا اشعار و مکاتیب و خطب امیرالمومنین علیہ السلام اگر کچھ پڑھا جاتا تھا تو قرآن و حدیث و آثارِ علی۔ اگر کسی کو ادب پہ کچھ لکھنا ہوتا تھا تو کتاب کا سب سے زیادہ اہم مواد انھیں تین چیزوں پر مشتمل ہوتا تھا۔

ادب کا قاعدہ ہے کہ کلاسیکل لٹریچر ادیبوں کے لئے مثالی نمونہ ہوتا ہے، کلاسیکی تالیفِ انشا پردازوں کے لئے رہنما ہوتی ہے، صاحبانِ ذوق ادیب و فن کار اس کی تقلید

شروع کرتے ہیں، اگر ان کی تجرباتی کوشش کامیاب ہوگئی تو وہ اسلوب کم از کم ایک صدی تک زندہ رہتا ہے۔

عرب میں جہالت عام تھی اس لئے ترقی یافتہ ادب کی اُمید کم تھی، روایتی ادب اپنی عمرِ طبعی کو پہنچ گیا تھا کہ ایک معجزہ ہوا، اور آسمان سے قرآن نازل ہوا، نثر کی اس پُراعجاز کتاب نے رہی سہی قوتِ ادب کو شل کر دیا، لوگوں نے جب بھی اسے دیکھا، اس یقین میں پختہ سے پختہ تر ہوتے گئے کہ اس کے بعد ہماری کوشش رائیگاں ہوگی، اس لئے مزید کوشش بیکار ہے، امیر المومنینؑ نے اس اسلوب کو اپنا کر اتنی تقریریں اور تحریریں پیش کیں کہ لوگوں کو راہ معلوم ہوگئی۔

قاعدہ ہے کہ متن کی شرح متن کی رُوح سے متعارف کرتی ہے۔ تصویر کے نقوش اگر مبہم ہوں تو اس کا حسن کچھ دن تک قابلِ توجہ رہنے کے بعد لوگوں کی نظر سے گر جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی واقفِ فن اس کے ابہام کو دُور کر دے، رنگ اور خطوط کے اشارات کی توضیح کر دے، انھیں رنگوں اور خطوط کی دوسری تصویریں بنا دیں تو وہ اسلوب سمجھ میں آجاتا ہے۔ اور اگر اس میں کوئی حسن ہے تو لوگ قابلِ تقلید سمجھ کر امتیازی مہارت ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کچھ دنوں کے بعد وہی فن متعدد نمونے پیش کرنے کا سبب ہوتا ہے، صاحبانِ ذہنِ رسا اعلیٰ درجہ کی قابلیت رکھنے والے فنکار اسی راہ سے نئی نئی راہیں نکالتے ہیں، مگر ان سب کی انتہا اسی پہلے موجد کی طرف ہوتی ہے، وہی اُن کا محسنِ اعظم کہلاتا ہے۔

ہمارے ادب میں غالب کی نظم، آزاد و شبلی کی نثر دیکھئے، مدت تک غالب کے اشعار فنی ابہام کی وجہ سے قابلِ تقلید نہیں تھے، مگر جب اس کا تجزیہ کیا گیا، تشریح کی گئی تو ہر چھوٹا بڑا اس اسلوب کو اپنانے لگا۔ آزاد و حالی کی نثر، شبلی اور نذیر احمد کا اسلوب شروع شروع میں حیران کن تھا، مگر جب خواجہ حسن نظامی اور عبدالحق وغیرہ نے اسے اپنایا

تو وہی اسلوب مختلف اسکولوں کے لیے سنگ میل ثابت ہوا، نئی نسلوں نے اس عظیم ادب کو اپنایا، اور اپنے ادب کو بے پناہ وسعتیں بخشیں، مگر یہ اقدام مثالی جرأت، غیر معمولی ذہانت، قابلیت چاہتا ہے، اس کے بعد ادب کی زندگی ان کے احسانات کی نمائندہ بن جاتی ہے۔

امیر المومنین علیہ السّلام وہ منفرد حکیم ہیں جنھوں نے عربی ادب میں اس تجربہ کی طرف قدم بڑھایا اور اس شان سے کہ یا تو ایک بھی قابلِ ذکر لکھنے اور بولنے والا عرب ادیب نظر نہ آتا تھا، یا یہ عالم ہو گیا کہ تاریخ میں ادیبوں کے نام اس قدر نظر آتے ہیں کہ ان کی فہرست بنانا ادب کا خود ایک شعبہ بن گیا، اب اسے فنی برتری کہیے یا معجزہ کہ ابن عباسؓ، سحبان وائل، ابنِ مزاحم، ابنِ عمید، صاحب بن عباد، جاحظ، ابن درید، خلیل، مُبَرّد، اصمعی، تو پیدا ہو گئے، مگر علی ابن ابی طالب بے مثال ہی رہے، یا یوں کہا جائے کہ امیر المومنینؑ کے بے مثال ادب نے بے مثال ادیب تو پیدا کئے مگر کوئی ادیب علیؑ کے ادب کا جواب پیش نہ کر سکا۔

آج تاریخِ ادب میں کاتبوں کے خطوط، مقرروں کی تقریریں تو ملتی ہیں، مگر "نہج البلاغہ" نہیں ملتی، انشاء پردازوں کی بلاغت کے نمونے تو ملتے ہیں، مگر کسی کا ایسا بلاغت آفریں مجموعہ نہیں ملتا جسے دیکھ کر ایک عرب عالم ادیب بن جائے۔ مشہور عالم عبدالحمید، ابنِ مقفع، ابن نباتہ، قاضی بن سلامہ، مؤلف دستور معالم الحکم کلامِ امیر المومنینؑ کا ایک قدیم مجموعہ جو ابتک کئی مرتبہ چھپ چکا ہے، مسعودی، جاحظ، غرض تمام قابلِ ذکر افراد نے اسے حرزِ جان و وردِ زبان بنایا اور ادب کے ستون اور عربی کے محسن بن گئے، اور اپنے اس کسبِ فیض پر فخریہ انداز میں کہا کہ "حفظت سبعین خطبة من خطب الاصلع ففاضت ثم فاضت" میں نے

علی بن ابیطالب کے خطبوں میں سے صرف ستر خطبے یاد کئے تھے کہ ادب کے دریا بہنے لگے [1]

یہ شرف آج تک صرف ادب امیرالمومنین علیہ السلام کو حاصل ہے کہ قرآن کے بعد نثری و ادبی اسلوب بغیر کلام علیؑ کا مطالعہ کئے حاصل نہیں ہوتا۔

آج ساری دنیا متفق ہے کہ ڈرامہ، افسانہ، قصہ، غزل، قطعہ، مثنوی غرض کہ کوئی صنفِ ادب صحیح طور پر معیاری اُس وقت ہوتی ہے جب اس سے زندگی کو فائدہ پہنچے، زبان کو وسعت حاصل ہو، ادب میں مواد کا اضافہ ہو، امیرالمومنینؑ کا یہ بے مثال احسان ہے کہ حضرت نے عربی ادب میں سب سے پہلے، اظہارِ بیان، فلسفہ و کلام، تاریخ، نفسیات، قومی اور انفرادی اصلاح، اخلاق اور ذہنی برتری کے مضامین کا بحرِ بے پایاں اور دفترِ طولانی کا ایک اضافہ ہی نہیں کیا بلکہ اس طریقہ کو خود ہی ایجاد کیا اور خود ہی ختم کر دیا، اب جو بھی لکھا جائے گا اسکی بدولت لکھا جائے گا۔

امیرالمومنینؑ نے دل و دماغ وضع کئے، اسلوب آہنگ پیدا کئے، لفظوں اور معنوں کا استعمال، استعمال کو مواقع عطا کئے، ان سے پہلے کوئی ادیب ایسا نہیں گذرا جس کی بزمیہ تقریر سن کر کوئی بے ہوش ہوا ہو، حضرتؑ نے وہ انداز پیش کیا جسے سن کر ادیب کیلئے تقاضا ہوا کہ "یا علیؑ یہ تقریر جاری رکھئے" ان سے پہلے کسی نے اپنے آپ کو "اِنَّا لَاُمَرَاءُ الکلام" نہیں کہا۔ حضرتؑ کے ادبی احسانات میں فقط ذہن و زبان کی محیر العقول پیش کشوں، اسالیب، عناوین کی معیاری تحریروں یا تقریروں، شعروں یا حکیمانہ جملوں کا عظیم الشان مجموعہ ہی نہیں،

---

[1] یہ جملہ عرب کے پہلے نامور ادیب عبدالحمید بن یحییٰ متوفی سنہ ۱۳۲ھ کا ہے جسے کئی ادیبوں نے اپنے لئے دہرایا ہے۔

بلکہ حضرت نے حسنِ ادا، معراجِ ترکیب، خوبیٔ گفتار، بلندیٔ مطالب، استفادہ و اقتباس قرآن کی بے مثال ندرتوں اور مرصع کاریوں کے علاوہ جہانِ زبان و ادب کی قدریں متعین فرما کر عربی ادب کو زندگی بخشی، وہاں نقد و انتقاد کی راہ کھولی، آپ نے فرمایا۔

وَ اِنَّ الامور اذا اشتبهت اعتبر باولها۔	یہ اصول یاد رہے کہ جب کسی معاملے میں حقیقت مشتبہ ہو تو آغازِ عمل و ابتداء کو یاد رکھو۔

ادب میں پس منظر سے واقفیت، فنی جائزہ اور صحیح نتیجہ تک پہنچنے کی یہ پہلی شرط ہے۔ جسے حضرت نے اہمیت کے ساتھ سب سے پہلے بطورِ اصول ہمیں سمجھایا ہے۔ یا حضرت کا ارشاد کہ۔

قیمة المرءِ ما یُحْسِنُهٗ [1]	ہر شخص کا شاہکار ہی اس کی قیمت ہے۔

یہ باتیں تخمینی اور خیالی طور پر نہیں لکھی جا رہی ہیں بلکہ نہج البلاغہ کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے۔ حضرت ان ادبی حقیقتوں کو مناسب موقعوں پر بتاتے رہتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ اپنے کاتب عبید اللہ بن ابی رافع سے فرمایا تھا۔

اَلِقْ دواتك، وَاَطِلْ جلفة قلمك، وفرّج بین السطور، وقرمط بین الحروف — فانّ ذٰلك اجدر بصباحة الخط۔	دوات صاف رکھا کرو، قلم کی زبان ذرا چوڑی ہونا چاہیئے، سطروں میں فاصلہ کا خیال رہے، حروف کے جوڑ موزوں طریقہ سے ملانا چاہیئے (حروف کٹے کٹے نہ ہوں) کیونکہ ان باتوں سے خط میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔

(نہج، کلمہ ۳۰۸، طبع لاہور)

---

[1] سید رضی نے لکھا ہے کہ نہ اس حکیمانہ جملے کی کوئی قیمت معین کی جا سکتی ہے نہ کوئی حکیمانہ کلام اس کے مقابلے میں لایا جا سکتا ہے۔ ابن خلدون نے تو اپنے مقدمہ کی کتاب اول، فصل ۱۹۷ میں کافی فلسفیانہ بحث کی ہے۔ دیکھیے ہماری شرح مقدمۂ ابن خلدون جو مکمل ہو کر منتظرِ اشاعت پڑی ہے۔ (مرتضیٰ)

ہمارے زمانہ میں جب کہ ادبی شعور اپنے شباب پر ہے، فن کار ادیب اپنی تحریر کے لئے دیدہ زیب کتابت و طباعت کے قائل ہیں، یہ مانا جا چکا ہے کہ ادب کے اشارات، فن کے نکتے اُس وقت تک تشنۂ اظہار رہتے ہیں، جب تک بیان کے وقت تلفظ، لہجہ، اندازِ بیان، میں توضیحی علامتیں نہ ہوں، اسی طرح تحریر میں اگر معینہ علامتیں استعمال نہ ہوں تو ادبی لطافتیں دب جاتی ہیں، ناظر و قاری ادیب کی ذہنی کیفیت اور ادب کی لطافتوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا، اِس تجربہ اور تجزیہ کی روشنی میں امیر المومنین علیہ السّلام کا یہ ارشاد دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ حضرتؑ نے عام ادب پر عموماً اور عربی ادب پر خصوصاً کتنا بڑا احسان فرمایا ہے۔

اس جذبۂ معرفت آموزی و بصیرت پاشی کا اثر تھا کہ حضرتؑ ادیبوں کی جماعتیں دیکھنا چاہتے تھے، آپ نے نئی نسلوں کو پیغام دیا ہے کہ :- تَكَلَّمُوا تُعْرَفُوا فَإِنَّ الْمَرْءَ مَخْبُوءٌ تَحْتَ لِسَانِهِ ۔ بولنا سیکھو اور بولا کرو، لوگ تمہاری قدر و قیمت معلوم کر سکیں گے، کیونکہ انسان زبان کے پردے میں چھپا ہوا ہے۔ مولانا سعدی نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے :-

تا مرد سخن نگفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

* * *

یک الفِ بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز،

کلامِ علیؑ
کا
عربی ادب پر اثر

کسی مسئلہ کی تاثیر یا تاثر معلوم کرنے کے لئے موضوع بحث کو تجریدی حالت میں دیکھنا تقریباً ناممکن ہوا کرتا ہے، اس لئے موضوع کا پس منظر اور اس کے مستقبل کا جائزہ لے کر فیصلہ آسان اور قیاسات واضح ہو جاتا ہے۔

بحث یہ ہے کہ "عربی ادب" پر "کلامِ علیؑ" کا "اثر" ہوا یا نہیں؟ اور ادب میں وہ کون سی خصوصیتیں پیدا ہوئیں جن سے یہ معلوم ہو کہ "کلامِ علیؑ" نے ادب کو متاثر کیا؟ مشکل یہ ہے کہ "عہدِ[1] تہذیبِ تاریخ" سے پہلے کسی خاص چیز کا پس منظر معلوم کرنا "کھدائی" اور زمین میں معدنیات کی تلاش سے کم نہیں

ادبِ جاہلیت

البتہ کلامِ علیؑ کا پس منظر سمجھنے کے لئے "ادب قبل از اسلام" کا مطالعہ کرنا ضروری ہے یہ مطالعہ اگرچہ کافی طولانی ہے لیکن مختصر یہ ہے کہ "ادب قبل از اسلام" جسے ادب جاہلیت

---

[1] میں تاریخ کے تینوں عہدوں کو، عہدِ قصص، عہدِ تدوین، عہدِ تہذیب کہتا ہوں۔

کہتے ہیں ایک جاندار، زندہ، اور تاریخی ادب ہے، اس کے دامن میں تیز و تند ہوائیں، زلزلے کی آندھیاں، چٹیل میدان، اطلال و دمن، اونچی نیچی پہاڑیوں پر آگ کی شعلہ فشانی، یا کبھی کسی آبادی کے کھنڈر اور رزمگاہوں میں تلواروں کی چمک نظر آتی ہے، اس میں چلتے پھرتے قبیلوں کا نظامِ معاشرت، شہریوں کا اندازِ زندگی، قبائل کی خانہ جنگیاں، افراد کے ذہنی، اخلاقی اور فکر کے سطحی اور رنگین مرقعے نظر آتے ہیں۔

شخصی و اجتماعی کردار، قومی اور قبائلی دستور اگر تلاش کرنا ہوں تو ادبِ جاہلیت بے مثال دستاویز ہے، سادگی، شجاعت، حریت اور جنگجوئی کے جذبات کا یہ دفتر فصاحت آفرین، حیرت انگیز حد تک متاثر کن ہے، لیکن وہ عرب جو شعر کو سجدہ گاہ جانتا تھا جس نے بنی کعب کو ہر حکومت و برتری بخشا دی تھی جو اپنے شاعر کے نشترکار کو "جاوداں" اس قدر ادب پرستی کے باوجود بھی اس کے لٹریچر میں ایک خلا ہے، اور وہ ہے "نثر" کا فقدان، مورخین ... اور آثارِ ادب میں قصے، لمبی کہانیوں، یا مذہبی نثر کا نام نہیں، بلکہ وہ صرف یہ بتاتے ہیں کہ بازاروں میں اگر ایک طرف شاعر اپنے قصیدے، غزلیں، ترانے اور "شاہ نامے" سناتا تھا تو دوسری طرف ان کے شعلہ بیان خطیب تقریریں کرتے تھے، یہ تقریریں رزم میں برجستہ، مدلل، انقلاب آفرین و فخریہ تھیں، اور بزم میں مسرت خیز و فخر آمیز و مسجع عبارت، اجتماعی انداز باقاعدگی و سنجیدگی سے بھاری، مگر یہ دونوں نثریں بنیادی خیال، موضوعی فکر اور مقصدِ انشاء سے خالی تھیں، خطیب محنت کرتا تھا اور وہ حاصل کر کے فنی کمال کا مظاہرہ کرتا تھا، قلقشندی کا بیان ہے کہ

واعلم انه كان للعرب بالخطب والنثر
غاية الاعتناء حتى قال صاحب
الريحان والريعان ان ما تكلمت

عرب تقریروں اور نثر پر پوری توجہ دیتے تھے،
صاحب "الریحان والریعان" کے بقول:
شہری اور بادیہ نشین عربوں نے اعلیٰ درجہ

به العرب من اهل المدر، والوبر من جيّد المنثور، ومزدوج الكلام اكثر مما تكلمت به من الموزون عُشره، ولا ضاع من الموزون عُشره (صبح الاعشیٰ ۱/۲۱۲)

اور معیاری مرتبہ کی نثر، نظم سے زیادہ استعمال کی، مگر نثر کا دسواں حصّہ بھی محفوظ اور نثر کا دسواں حصّہ بھی ضائع نہ ہو سکا۔

یہ خطیب دو طرح کی تقریریں کرتے تھے، تمہیدی اور غیر تمہیدی تقریریں "بترا" کہلاتی تھیں، پھر یہ خطبے دو طرح سے پیش کئے جاتے تھے "کھڑے ہو کر بولنے والے" جاحظ نے ان لوگوں کے بارے میں بڑے معلومات فراہم کئے ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ کھڑے ہو کر بولنے والے مقرر، سیاسی و معاشرتی موقعوں پر کھڑے ہو کر بولتے تھے، اور فقط نکاح کا خطبہ بیٹھ کر ادا کیا جاتا تھا۔ اسٹیج کے خطبوں کا انداز یہ ہوتا تھا کہ۔

وكان لكل قبيلة خطيب كما كان لكل قبيلة شاعر۔

جس طرح ہر قبیلے کا ایک شاعر ہوا کرتا تھا اسی طرح ہر قبیلے کا ایک خطیب بھی تھا۔

واكثر ما كانت الخطابة في التحريض على القتال والتحكيم في الخصومات واصلاح ذات البين، وفي المفاخرات والمنافرات والوصايا وغير ذالك۔

اکثر جنگی تحریک یا آپس کے جھگڑوں میں فیصلے، صلح صفائی، فخریہ و ہجویہ یا وصیت و نصیحت وغیرہ کے موقعوں۔

وكان من عادة الخطيب في غير خطب الاملاك والتزويج ان يخطب قائما او على نشز مرتفع من الارض او على ظهر راحلة لابعاد مدى الصوت والتاثير

پر یہ لوگ بولتے تھے، کسی چیز کے دینے، یا عقد نکاح کے علاوہ "خطیب" کھڑے ہو کر بولتے تھے، یہ اسٹیج یا تو کوئی چبوترہ، ٹیلا، ہوتا تھا، یا اونٹ کی پیٹھ پر سے یہ کام لیتے تھے۔

بشخص، واظہار علامۃ وجہہ و حرکۃ جوارحہ، ولا غنی لہ عن لوث العمامۃ والاعتماد علی مخصرۃ او عصی او قناۃ او قوس۔

وربما اشار باحدها[1] او بیدہ۔ (جواہر الادب ج ۲)

مقصد یہ تھا کہ آواز دور تک پہنچے، شخصیت سے مرعوب کیا جائے، چہرے کے اتار چڑھاؤ دکھائے جائیں۔

اس کے علاوہ کچھ اور بھی کیا جاتا تھا، مثلاً عمامہ باندھتے تھے، چھڑی، نیزہ یا کمان ہاتھ میں ہوتا تھا۔ اور کبھی چشم و ابرو و ہاتھ سے اشارہ بھی کرتے تھے۔

اس دور کے بڑے بڑے بولنے والے خطیبوں میں چند افراد یہ ہیں:

(۱) قیس بن خارجہ (م سنہ ۶۰۰ء تقریباً) یہ شخص نجران کا لاٹ پادری، حکیم و مبلغ کے علاوہ جنگ داحس و غبرا کا خطیب مانا گیا ہے۔

(۲) خویلد بن عمرو غطفانی، جنگ فجار کا مقرر۔ "عکاظ"

(۳) قیس بن ساعدہ، عرب کے مشہور بازار اور عظیم الشان میلے "عکاظ" کا خطیب جس کا ایک خطبہ رسالت مآبؐ نے بھی سنا تھا اور حضرتؐ ہی کی روایت نے اس کے ایک خطبے کو محفوظ فرمایا۔ (الصبح الاعشیٰ۔ ج ۱، صفحہ ۲۱۲)

(۴) اکثم بن صیفی جو نعمان بن منذر کی طرف سے دربار کسریٰ میں جانے والے وفد کا صدر تھا۔

(۵) ابو ثور عمرو بن معدیکرب الزبیدی، جو اندازاً ۵۳۳ء میں پیدا اور ۶۴۳ء میں مرا ہے۔ یہ یمن کا بہادر، عرب کا خطیب اور غضب کا ادیب تھا۔ سنہ ۹ھ میں مسلمان ہو کر مرتد ہوا، پھر اسلام لایا اور مسلمان مرا۔ (تاریخ ادب العرب احمد حسن زیات ص ۱۷۴۔ المنجد ص ۴۸)

(۶) یونس بن حبیب، جسے ابن رشیق "علّامۃً فی الخُطب" فن تقریر کا شیر کہتا ہے۔

---

[1] اصل میں احداھا ہے۔ قلقشندی کا بیان ہے کہ سارے ضخامت بدن کی وجہ سے بیٹھ کر تقریر کرتے تھے۔

(کتاب العمدہ ج ا ص ۲۶)

(۸/۷) ان کے علاوہ قریش کے آتش نفس مقررین میں جناب رسالتمآبؐ و امیرالمومنینؑ کے جدِ معظم کعب بن لوی" ہیں۔ سید احمد ہاشمی لکھتے ہیں:-

مِنْ أقدمھم کعب بن لوی وکان	ان خطیبوں میں قدیم ترین بزرگ کعب بن لوی
ذا نفوذٍ عظیم فی قومہ حتّیٰ	ہیں جو اپنی قوم میں بڑے صاحب اثر و اقتدار تھے۔
أکبروا موتہ۔ (جواہر الادب ج ۲ ص ۱۹)	حتیٰ کہ ان کی موت کو بڑی اہمیت دی گئی۔[1]

"قلقشندی کا بیان ہے کہ اس عہد میں عرب نے فن خطابت میں اچھی خاصی ترقی کر لی تھی، مگر وہ سرمایہ ضائع ہو گیا، قیس کا خطبہ آنحضرتؐ کی توجہ اور کعب کا خطبہ ان کی جلالت کے ہاتھوں بچ گیا، یا پھر حضرت ابوطالب (پدر جناب امیرؑ و مربی جناب رسالتمآبؐ) کا وہ خطبہ محفوظ ہے جو آپ نے عقد جناب خدیجہؓ کے موقعہ پر ارشاد فرمایا تھا۔

ألحمد للہ الذی جعلنا من ذریۃ[2]	اس خدا کا شکر جس نے ہم کو ذریت ابراہیم
ابراھیم وزرع اسماعیل وضئضئ	و کشت اسماعیل پشت معد اور نسل مضر میں
معد وعنصر مضر۔ وجعل لنا بیتاً	خلق کیا، اپنا مرکز حج و خانہ کعبہ اور امن کا
محجوجاً وحرماً آمناً وجعلنا أمناء بیتہ	حرم ہمیں عطا فرما کر اس کا امین اور محافظ
وسُوّاس حرمہ وجعلنا حکاماً علی الناس۔	قرار دے کر لوگوں پر حکومت کا حق دیا۔
ثمّ انّ ابن أخی ۔ محمد بن عبداللہ۔	میرے بھائی کا فرزند محمدؐ --- وہ ہے
من قد علمتم قرابتہ، وھو لا یوزن	جس سے میرے تعلق کو آپ سب جانتے ہیں۔

---

[1] ان کی تقریر کے لئے ملاحظہ ہو الصبح الاعشیٰ ج ا ص ۲۱۱ بحوالہ کتاب الاوائل، ابوہلال عسکری۔

[2] نرزع ابراھیم وذریۃ اسمٰعیل۔ الصبح الاعشیٰ ۱/۲۱۳ المجلہ ۱/۴۲؛ (۱۳ کے پہلے ص ۳ دیکھئے)

به احداً الا رجح به، فان كان في المال قلّ، فان المال ظلّ زائل۔ وقد خطب خديجة بنت خويلد وبذل لها من الصداق ما عاجله وآجله من مالي كذا وكذا وهو والله بعد هذا له نبأ عظيم وخطر جليل۔ (كتاب التاريخ اللغة العربية ص ۲)

یہ وہ شخص ہے کہ اس کے مقابلے میں جسے بھی تولو گے جھکا دے گا، اگرچہ مال کم ہے لیکن دولت تو ڈھلتا سایہ اور چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ اس فرزند نے خدیجہ بنت خویلد سے نکاح کرنا چاہا ہے، اتنی رقم فوری اور تاخیر کی ادائیگی میرے مال سے ہو رہی ہے۔ خدا کی قسم اس عظیم الشان انسان کے متعلق بڑی بڑی پیشگوئیاں اور عظمتیں ہیں۔

خطبے لبد کے ادیبوں نے جستہ جستہ محفوظ تو کیے لیکن نہ اُن کی روایت مسلسل ہے نہ ترتیب، پھر ان کی مقدار و نوعیت بھی قابلِ اہمیت نہیں، نہ عوام نے اس سے دلچسپی ظاہر کی نہ خطیبوں نے راوی رکھے، لوگوں نے بات سنی اور بہت پسند کیا تو ایک آدھ جملہ اپنا لیا، علم تھا نہیں، تحریر جانتے نہ تھے، خشک و طویل عبارتیں حافظے میں کیسے رہ سکتی تھیں، پھر مقابلہ تھا ہنگامہ آفرین قصیدوں، جوش آور رجزوں اور ولولہ انگیز و نصیحت خیز نظموں سے، لہٰذا یہ لے دب گئی اور تنقید و تاریخ کے ماہرین نے صرف یہ کہہ کر قلم روک لیا کہ یہ ادب مقفّٰے مسجّع، سادہ و غیر مسلسل، ادب اور رنگا رنگ اسلوب رکھتا ہے جس میں اخلاق زیادہ اور علم کم ہے۔

(باقی آئندہ)

---

[1] ... ثم ان محمد بن عبد الله ابن اخي من لا يوزن به فتى من قريش الا رجح به برا وفضلا وعقلا ومجدا ونبلا۔ وان كان في المال قلّ، فان المال عارية مسترجعة وظلّ زائل، وله في خديجة بنت خويلد رغبة ولها فيه مثل ذالك وما اردتم من الصداق فعلي۔ (الجبل ص ۲۷ ج ۱)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جناب سید رضی جعفر نقوی

مستقبل کی نسلوں کے نام
حضرت امام علیؑ کا پیغام

ویسے تو مولائے کائنات کے تمام فرمودات آپ کا ہر جملہ اور ہر فقرہ حکمت و معرفت کا انمول خزینہ ہے اور آپ کے تمام ارشادات میں بنی نوع انسان کے لئے ہدایت کا سامان موجود ہے۔ لیکن خاص طور پر آپ کی وہ وصیت جو آپؑ نے اپنے فرزند ارجمندؑ کے نام فرمائی ہے وہ نسل نوع انسانی کے لئے ایک خصوصی پیغام کی حیثیت رکھتی ہے ہماری دعا ہے کہ زیر نظر مقالہ صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کے لئے مشعل ہدایت ثابت ہو اور زندگی کی تاریکیوں میں چراغ راہ بن کر بھٹکے ہوئے انسانوں کو نجات کے راستے پر چلنے میں سہارا دے سکے۔ کیونکہ یہی اس مقالے کو پیش کرنے کا مقصد ہے

گر قبول افتد زہے عز و شرف

حضرت امیر المومنینؑ فرماتے ہیں۔

"یہ وصیت نامہ اس باپ کی طرف سے ہے جو دنیا سے جانے والا ہے جسے زمانہ (کی چیرہ دستیوں) کا اقرار و اعتراف ہے جس کا پیمانۂ عمر اب لبریز ہونے والا ہے اور جو زمانہ کی سختیوں کے آگے سپر انداختہ ہے۔ دنیا کی برائیوں کا ادراک رکھتا ہے موت سے ہمکنار ہونے والوں کے گھروں میں مقیم ہے اور کل کو یہاں سے رخت سفر باندھنے والا ہے۔"

(من الوالد الفان) گویا آپؑ فرمانا چاہتے ہیں کہ دنیا والے میرے ان کلمات کو اس حیثیت سے نہ دیکھیں کہ امیر المومنینؑ، امام المتقینؑ، یعسوب الدین، فاتح بدر و حنینؑ، والد حسنینؑ، برادر رسولؐ اکرم، شوہر بتولؑ، غالب علی کل غالب، فرزند ابوطالب، کل ایمان

امام انس والجان، ساقی کوثر، فاتح خیبر، شیر خدا، مشکل کشا، وصی حضرت محمد مصطفیٰؐ حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے۔

اور پھر اس فکر میں پڑ جائیں کہ مولائے کائنات نے اپنے آپ کو فنا ہونے والا کیوں لکھا؟ جبکہ وہ حیات جاوداں کے مالک ہیں۔ انھوں نے خود کو زمانہ کا معترف کیوں قرار دیا ہے۔ جبکہ زمانہ ان سے لرزتا تھا۔ زمانے کی سختیوں کے آگے خود کو سپر انداختہ کیوں کہا؟ جبکہ ایک زمانہ کیا کوئی بھی زمانہ، آج کا یا کبھی کا بھی آپؑ پر غالب آنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ بلکہ آپؑ غالب علی کل غالب ہیں۔

ان تمام باتوں کا اور اس قسم کے ہر سوال کا جواب پہلے ہی جملے میں موجود ہے اور وہ یہ کہ اس وصیت نامہ کو اس حیثیت سے مت دیکھو کہ وصیت کس نے تحریر فرمائی ہے بلکہ اس حیثیت سے دیکھو کہ یہ ایک ایسے باپ کی وصیت ہے جو عنقریب دار فانی سے جانے والا ہے۔

اور جب اُسے ہمہ گیری کے ساتھ دیکھا جائے گا تو اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ وصیت نامہ بلا تفریق مذہب و ملت دنیا کے ہر انسان کے لئے دستور العمل قرار پائے گا۔ تاکہ کوئی شخص اسے صرف مسلمانوں کی مذہبی دستاویز نہ سمجھے، بلکہ بنی نوع انسان کی نجات کا سرمایہ قرار دے جس میں خطاب کرنے والا ایک باپ ہے اور جس سے خطاب کیا گیا وہ ایک بیٹا ہے اور اس طرح دنیا کے ہر باپ بیٹے کے لئے یہ وصیت نامہ ایک درس حیات قرار پائے۔ اور اس قسم کی جامعیت و ہمہ گیری امیر المومنینؑ کے بیشتر خطبات و کلمات میں نظر آتی ہے۔ اور آپ کی بلاغت و فصاحت کی اسی بلندی کو دیکھتے ہوئے دنیا بھر کے صاحبان فکر و نظر آپؑ کے ارشادات کے بارے میں یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ تحت کلام الخالق فوق الکلام المخلوق (آپؑ کا کلام خالق دوجہاں کے کلام سے فروتر مخلوق کے کلام سے بلند تر ہے) اور یہی وہ بات ہے جس نے "نہج البلاغہ" کو دنیا بھر کی کتابوں پر ایک خصوصی امتیاز عطا کیا ہے۔

maablib.org

حضرت امیر المومنینؑ اپنے وصیت نامہ میں "باپ" کی خصوصیات پر روشنی ڈالنے کے بعد اسی سے مماثل انداز میں بیٹے کی صفات کا تذکرہ فرماتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ۔

(یہ وصیت نامہ ایک باپ کی طرف سے) ایک ایسے بیٹے کے نام ہے جسے ان باتوں کی بھی آرزو ہو سکتی ہے، جنہیں وہ نہ پا سکے گا، جادۂ عدم کا راہ سپار، بیماریوں کا ہدف، زمانے کے ہاتھوں گروی، مصیبتوں کا نشانہ، دنیا کے ہاتھوں بے بس۔ اس کی ناپائیداریوں کا تاجر[2]، موت کا قرضدار، اجل کا قیدی، غموں کا حلیف، حزن ملال کا ساتھی، آفتوں میں مبتلا، نفس سے عاجز[3] اور دنیا سے جانے والوں کا جانشین ہے)

امیر المومنینؑ کے فرمان رفیع الشان کا ایک ایک فقرہ اپنے اندر مطالب و معانی کا ایک عمیق سمندر لئے ہوئے ہے جو ساری دنیا کو دعوت فکر و عمل دے رہا۔ اور عقل سلیم رکھنے والوں کو پکار پکار کر نصیحت کر رہا ہے کہ اس دنیائے ناپائیدار کے دھوکے میں نہ آنا کیونکہ "کل شیئٍ ھالک الا وجہہ" اور اسی کے ساتھ یہ تمام فقرے اس بات کی طرف بھی متوجہ کر رہے ہیں کہ اس ہدایت نامہ کو کسی خاص شخص کے لئے مخصوص نہ سمجھا اور یہ نہ سمجھا کہ بس یہ نصیحتیں حضرت امیر المومنینؑ نے اپنے کسی فرزند کو فرمائی تھیں جو اسی زمانے یا اسی فرزند کے لئے تھیں۔ بلکہ جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا ہے اس پورے وصیت نامہ کی یہ خصوصیت ہے کہ قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسانوں کو دعوت فکر و عمل دے رہا ہے اور اسی لئے ہم نے اس کا عنوان یہ قرار دیا ہے کہ "حضرت علیؑ کا پیام نسل نو کے نام" اور مطالب کی ہمہ گیری اور مفاہیم کی جامعیت خود ہی اعلان کر رہی ہے کہ یہ وصیت نامہ"

---

[1] اس لئے کہ انسان اس دنیا میں ان گنت ایسی باتوں کی تمنا کرتا ہے جن کے حصول سے عاجز رہتا ہے بقول شاعر ۔ "ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے"۔

[2] "ناپائیداریوں کا تاجر" اس لئے فرمایا کہ اس دنیائے ناپائیدار میں جتنی چیزیں ہیں ذات واجب کے علاوہ کسی کیلئے بقا ہے نہ دوام۔ اسی لئے دنیا کے کاروبار میں حصہ لینے والے انسان درحقیقت ایسی چیزوں کا کاروبار کرتے ہیں جو ناپائیدار ہیں۔

[3] "نفس سے عاجز" یہ ابنائے دنیا کی ایک عمومی روش کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اچھی غذا کی طلب، اچھے لباس کی آرزو، اچھی رہائشگاہ کی تمنا، اور دنیاوی جاہ و حشم کی خواہش یہ تمام چیزیں وہ ہیں جن کا نفس مطالبہ کرتا ہے اور انسان نفس کے مطالبے کے آگے بے بس ہو کر ان چیزوں کے حصول میں لگا رہتا ہے یہاں تک کہ اسی تگ و دو میں زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

اگرچہ ایک باپ کا اپنے بیٹے کے نام ہے لیکن درحقیقت یہ ایک منشورِ حیات ہے تمام آنے والی نسلوں کے لئے ۔

اصلاحِ نفس

حضرت امیرالمؤمنینؑ ارشاد فرماتے ہیں ۔

"تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے دنیا کی روگردانی ، زمانے کی منہ زوری اور آخرت کی پیش قدمی سے جو حقیقت پہچانی ہے وہ اس امر کے لئے کافی ہے کہ مجھے دوسرے تذکروں اور اپنی فکر کے علاوہ کوئی فکر نہ رہے۔

یعنی دنیا کے تغیرات ، زمانے کے حادثات اور منازلِ آخرت کے واقعات انسان کو دعوت دیتے رہتے ہیں کہ ہر چیز سے بے پرواہ ہو کر اصلاحِ نفس کی طرف مائل ہو جاؤ اور تمہیں ہر آن بس اپنی سیرت و کردار کی تعمیر ہی کی طرف متوجہ رہنا چاہیے اور ہر قسم کی مصروفیات کو ترک کر کے اپنے نفس کی آراستگی میں مصروف ہو جانا چاہیے کیونکہ دنیا کا یہ سفر عنقریب ختم ہو جائے گا۔ اور پھر آخرت کے اُن حالات کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ جہاں نہ مال کام آئے گا نہ دولت ، نہ اقتدار ، نہ حکومت ، نہ جاہ و حشم ، نہ ثروت ، نہ عہدہ و منصب نہ معاشرتی حیثیت بلکہ صرف پاکیزگیٔ نفس اور عظمتِ کردار ہی انسان کو اُس منزل پر رستگار بنا سکتی ہے ۔

اولاد کی محبت

حضرت امیرالمومنین فرماتے ہیں ۔

" آخرت کی سختیاں اتنی زیادہ اور وہاں کی بازپرس اتنی شدید ہے کہ انسان کو سوائے اپنی ذات کی اصلاح کے کوئی اور بات یاد نہ رہے "۔ البتہ اولاد سے انسان کا ایسا فطری اور مضبوط رشتہ ہے کہ اُس کی یاد سے دل خالی نہیں رہ سکتا چنانچہ آپؑ فرماتے ہیں ۔

"جب میں نے دوسروں کی فکر سے آزاد ہو کر اپنی ذات کے بارے میں سوچنا شروع کیا اور عقل و بصیرت ، خواہشات کے راستے سے الگ ہو کر اصابت رائے کے

ساتھ راہ پیما ہوئی اور حقیقتِ حال نکھر کر میرے سامنے آئی تو میں ایک ایسی خالص حقیقت اور بے لاگ صداقت تک پہنچا جو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ میں نے ادراک کیا کہ تم میرا ہی ایک جز ہو بلکہ جو میں ہوں وہی تم ہو۔ یہاں تک کہ اگر تم پر کوئی آفت آئے تو گویا مجھ پر آئی ہے اور تمہیں موت آئے تو گویا مجھے آئی ہے"۔

امیر المومنینؑ کے ان کلمات میں کائنات کی ایک اہم حقیقت پنہاں ہے اور وہ یہ کہ ماں باپ اور اولاد کے درمیان جو بھی رشتہ ہے وہ یورپ کے جدید فیشن کے مطابق "جبرِ طبیعت" نہیں ہے۔ جس کے نتیجے میں ماں باپ اولاد سے لاتعلق ہونے کی غیر فطری کوشش کرتے ہیں یا اولاد ماں باپ کو اپنے اوپر ایک وزن سمجھ کر جلد از جلد اپنے سر سے اتار پھینکنا چاہتی ہے۔ بلکہ اولاد کا ماں باپ سے تعلق ایک ٹھوس فطری حقیقت ہے اور انسان جب بھی اوہام و تخیل سے آزاد ہو کر حقیقت نفس الامری کی طرف متوجہ ہو گا۔ اور جب اپنی ذات کے بارے میں غور کرے گا تو اولاد کا خیال ضرور آئے گا اور فطری طور پہ یہ خواہش پیدا ہو گی کہ اگر میں کارگاہِ حیات میں ناکام رہا ہوں تو میری اولاد ناکام نہ رہے۔ اگر میری معاشرتی حیثیت بلند نہیں ہو سکی ہے تو میری اولاد کی ضرور بلند ہو اور اگر میں علم و معرفت سے محروم رہا ہوں تو میری اولاد علم و معرفت سے محروم نہ رہے۔

امیر المومنینؑ فرماتے ہیں کہ باپ کے دل میں بیٹے کی احتیاجات کا خیال پیدا ہونا وہ فطری صداقت ہے جو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے کیونکہ اولاد پر پڑنے والی مصیبتوں کو ماں باپ اپنے دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتے ہیں چنانچہ مولا فرماتے ہیں

جب میں نے یہ محسوس کیا کہ اولاد اگر پریشان ہو تو ماں باپ ضرور پریشان ہوتے ہیں۔ مجھے تمہارا بھی اتنا ہی خیال آیا جتنا مجھے خود اپنا خیال آسکتا ہے اور تمہارے مستقبل کی فکر کرتے ہوئے ہی میں نے یہ وصیت نامہ تمہاری رہنمائی کے لئے تحریر کیا ہے۔ اس امید کے ساتھ کہ یہ تمہارے لئے مددگار ثابت ہوگا خواہ اس کے بعد میں دنیا میں زندہ

رہوں یا دنیا سے رخصت ہو جاؤں

من سرہ الدھر ان یری الکبدا
یمشی علی الارض فنیا الولدا

جواہرِ حکمت

امیرالمومنین فرماتے ہیں ۔

میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرتے رہنا ۔ اُس کے احکام کی پابندی کرنا ۔ اُس کے ذکر سے قلب کو آباد رکھنا اور اُسی کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا ۔ کیونکہ تمہارے اور اللہ کے درمیان جو رشتہ ہے اس سے زیادہ پائیدار اور کون رشتہ ہو سکتا ہے ۔ ؟ بشرطیکہ تم مضبوطی سے اِس رشتہ سے وابستہ رہو ۔ جیسا کہ خالق دو جہاں کا ارشاد ہے ۔

واعتصموا بحبل اللہ : اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو یعنی کائنات میں سب سے بہتر اس رشتے کو سمجھو جو عبد و معبود، خالق و مخلوق اور اللہ اور انسان کے درمیان ہے ۔ کیونکہ اس کے علاوہ جتنے رشتے ہیں وہ سب ختم اور فنا سے ہم کنار ہو جانے والے اور شکست و ریخت سے دو چار ہونے والے ہیں صرف عبد و معبود کا رشتہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا چنانچہ قرآن مجید میں بار بار اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اس رشتے کو استوار رکھنے کی کوشش کرو جو سب سے اعلیٰ اور سب سے زیادہ مستحکم ہے ۔ اور اس رشتے کو زیادہ سے زیادہ پائیدار بنانے کے لئے جن باتوں کی ضرورت ہے ان کی طرف توجہ دلاتے ہوئے مولا فرماتے ہیں ۔

- وعظ و نصیحت سے اپنے دل کو زندہ کرو اور زہد کے ذریعہ نفسانی خواہشات کو مٹاؤ ۔ یقین کے ذریعے اسے قوت بخشو ۔ حکمت کی باتوں سے اس میں روشنی پیدا کرو ۔ موت کی یاد سے اسے قابو میں رکھو ۔ فنا کے احساس سے اس میں ٹھہراؤ پیدا کرو ۔ دنیا کے حادثات اس کے سامنے پیش کر کے اسے نصیحت کرو ۔ گردش روزگار سے اسے ڈراؤ ۔ زمانے کی بے ثباتی کا اسے احساس دلاؤ ۔ گزرے ہوئے لوگوں کے واقعات

اس کے سامنے رکھو اور تم سے قبل کے لوگوں پر جو بیتی ہے وہ اسے یاد دلاؤ۔

کیونکہ قلب ایک صاف و شفاف آئینہ کی مانند ہے اس میں جو نقش و نگار بنانا چاہو بنا سکتے ہو۔ لہٰذا ایسے کام کرو جن کے ذریعے قلب کی اصلاح اور نفس کی تطہیر ہو۔ اور چونکہ مادی زندگی کی رنگینیاں انسان کو اپنی طرف کھینچتی اور نفس امارہ کی شرارتیں انسان کو جادۂ اعتدال سے منحرف کرتی رہتی ہیں اس لئے ان لوگوں کو مسلسل یاد کرتے رہو۔ جو دنیا سے گزر گئے تاکہ دنیا کی بے ثباتی کا احساس پیدا ہو چنانچہ مولا فرماتے ہیں۔

" جو لوگ دنیا سے گزر گئے۔ ان کے مکانات اور کھنڈرات میں چلو پھرو اور دیکھو کہ انہوں نے کیا کچھ کیا۔ کہاں سے کوچ کیا، کہاں اترے اور اب کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں تو تمہیں صاف نظر آئے گا کہ وہ لوگ اپنے دوستوں سے جدا ہو کر پردیس کے گھر میں پہنچ چکے ہیں اور وہ وقت دور نہیں جب تمہارا شمار بھی ان ہی لوگوں میں ہونے لگے گا۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج " ہم کل " تمہاری باری ہے

اور مومن کی شان یہ ہے کہ اپنے آپ کو ہر لمحہ موت کے لئے تیار رکھتا ہے۔ جیسا کہ حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

اعمل لدنیاك کانك تعیش ابدا
و اعمل لاخرتك کانك تموت غدا

یعنی دنیا کے لئے اس طرح کام کرو جیسے ہمیشہ رہنا ہے لیکن آخرت کی تیاری اس تیزی سے کرو گویا کل ہی دنیا سے رخصت ہونا ہے کیونکہ جسے پتہ چل جائے کہ اب کل اسے دنیا سے رخصت ہونا ہے تو وہ کوشش کرے گا کہ اپنے گناہوں سے توبہ کرلے خطاؤں کو بخشوا لے۔ اگر کسی برادر مومن سے ناراضگی ہے تو اس سے صلح کرلے کیونکہ حکم یہ ہے کہ کوئی مومن تین روز سے زیادہ ناراض نہ رہے۔ اگر کسی کا کوئی حق

ادا نہیں کیا تھا تو اس سے گلو خلاصی کرا لے کسی کو اذیت پہنچائی تھی تو اس سے معافی طلب کرے کسی سے قرض لیا ہو تو ادا کرے کچھ فرائض باقی ہوں تو انہیں انجام دینے کی کوشش کرے اور جن کاموں کو خود اس مختصر وقت میں انجام نہ دے سکے ان کے بارے میں اپنے اعزا و اقارب کو وصیت کر دے تاکہ اس کے بعد وہ ان کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں۔

ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ اسی وقت ہوگا جب انسان کو یہ احساس ہو کہ اسے مرنے کے بعد بارگاہ معبود میں اپنی ساری زندگی کا حساب پیش کرنا ہے چنانچہ امیر المومنینؑ فرماتے ہیں۔

"اپنی اگلی منزل کا انتظام کرو اور اپنی آخرت کا دنیا سے سودا نہ کرو جو بات نہ جانتے ہو اس کے متعلق گفتگو نہ کرو۔ اور جس چیز کا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے اس کے بارے میں زبان نہ کھولو اور جس راہ میں بھٹک جانے کا اندیشہ ہے اس کی طرف قدم نہ بڑھاؤ کیونکہ بھٹک جانے کی صورت میں سرگردانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان کے پیش نظر قدم روک لینا خطرات مول لینے سے بہتر ہے"

دستورِ حیات

امیر المومنینؑ فرماتے ہیں۔

نیکی کی تلقین کرو تاکہ تم خود بھی اہل خیر میں محسوب ہو ہاتھ اور زبان کے ذریعے برائی کو روکتے رہو۔ جہاں تک ہو سکے بروں سے الگ رہو۔ خدا کی راہ میں جہاد کا حق ادا کرو اور اس کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا اثر نہ لو۔

حق جہاں ہو اس تک پہنچنے کی کوشش کرو۔ اگرچہ اس کے لئے سختیوں میں کودنا پڑے۔ دین میں فہم و بصیرت سے کام لو۔ سختیوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کرو۔ کیونکہ حق کی راہ میں صبر و شکیبائی اور استقامت و پامردی بہترین سیرت ہے۔

تمام معاملات میں خود کو اللہ کے سپرد کر دو۔ کیونکہ اس طرح تم اپنے آپ کو ایک نہایت مضبوط پناہ گاہ اور قوی محافظ کے سپرد کر دو گے۔

صرف اپنے پروردگار ہی سے سوال کرو، اور سوال کے موقع پر انتہائی اخلاص سے کام لو۔ کیونکہ عطا کرنا یا محروم رکھنا صرف اسی کے اختیار میں ہے۔ اپنے پروردگار سے بھلائی کی زیادہ سے زیادہ درخواست کرو میری وصیت کو سمجھو اور اس سے روگردانی نہ کرنا۔ یاد رکھو اچھی بات وہی ہے جو (دنیا و آخرت کے لحاظ سے) فائدہ مند ہو اور اس علم میں کوئی بھلائی جو فائدہ رساں نہ ہو اور جس علم کا سیکھنا سزاوار نہ ہو اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

امیر المومنینؑ دنیائے انسانیت کو درس دے رہے ہیں کہ تمام مسائل میں اصل توجہ پروردگار عالم کی طرف ہونی چاہیے اور اس کی ذات پر اتنا اعتماد ہونا چاہیے کہ بندہ اپنے کو اس کے سپرد کر دے اور اس سپردگی میں اسے یہ یقین ہونا چاہیے کہ میں اپنی ذات کو جس کے سپرد کر رہا ہوں وہی مالک کائنات ہے اور اس کے قبضہ قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں بلکہ اسی کے زیر نگیں اور تابع فرمان ہے۔

لہٰذا ہر درخواست اسی کی بارگاہ بے نیاز میں پیش کرنی چاہیے کہ جس کی بارگاہ میں درخواست پیش کی جا رہی ہے وہ قادر مطلق ہے اور ہر خیر و فلاح کی اسی سے امید رکھنی چاہیے۔ جیسا کہ ارشاد قدرت ہے۔

یا ایہا الذین آمنوا توبوا الی اللہ توبۃ النصوحا

اے صاحبان ایمان اللہ کی طرف پورے اخلاص کے ساتھ رجوع کرو۔

گرانقدر تجربات

امیر المومنین فرماتے ہیں۔

اے نور نظر جب میں نے یہ محسوس کیا کہ اب میں کافی سن رسیدہ ہو چکا ہوں اور دن بدن جسمانی اضمحلال بڑھتا جا رہا ہے تو میں نے چاہا تمہیں وصیت کرنے میں اب تاخیر نہ ہونے پائے اس لئے میں نے اس میں جلدی کی اور اس میں کچھ اہم مضامین داخل کر دیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی تکمیل سے پہلے ہی پروانہ موت آ پہنچے اور دل کی بات دل ہی میں رہ جائے، یا کہیں ایسا نہ ہو کہ جسم کی طرح قوتِ فکر بھی اضمحلال

وناتوانی کا شکار ہونے لگے، یا یہ کہ میری نصیحت سے پہلے ہی تم پر کچھ خواہشات کا تسلط ہو جائے یا دنیا کے جھمیلے تمہیں گھیر لیں جس کی بنا پر تمہارا دل سخت ہو جائے اور تم پند و نصیحت سے گریز کرنے لگو۔ کیونکہ کمسن (نوجوان) کا دل اس زرخیز زمین کی مانند ہوتا ہے جس میں جو اعلیٰ بیج ڈالا جائے۔ تو عمدہ ہی درخت اُگے گا اور اگر معمولی چیز کا بیج ڈالا جائے تو معمولی چیز ہی اُگے گی لہٰذا قبل اس کے کہ تمہارا دل سخت ہو یا ذہن دوسری باتوں میں مشغول ہو جائے میں نے تمہیں تعلیم دینے کے لئے قدم اٹھایا تاکہ تم اپنی عقل سلیم اور فکر مستقیم کے ذریعے ان چیزوں کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جاؤ جن کی آزمائش اور تجربہ کی زحمت سے تجربہ کاروں نے تمہیں بچا لیا ہے۔ اس طرح تم تلاش کی زحمت سے بے نیاز اور تجربہ کی کلفتوں سے آسودہ رہو گے اور علم و تجربے کی وہ باتیں تمہیں کسی مشقت کے بغیر ہی مل جائیں گے جن کا ہمیں علم ہے اور پھر وہ باتیں بھی روشن و منور ہو کر تمہارے سامنے آ رہی ہیں کہ جن میں سے ہو سکتا ہے کچھ باتیں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی ہوں۔

ارباب نظر غور فرمائیں، یہاں بھی کلام کی وہی شان نمایاں ہے جس کی طرف ابتدائے کلام میں اشارہ کیا گیا۔ یعنی اس وصیت نامے کو اس انداز سے نہ دیکھا جائے کہ کون وصیت کر رہا ہے اور وصیت کرنے والا کس سے مخاطب ہے۔ بلکہ اس حیثیت سے اس کا مطالعہ کیا جائے کہ دنیا سے جانے والا ایک باپ اپنے بیٹے کو وصیت کر رہا ہے تاکہ بیٹا ناتجربہ کاری کی بنا پر نقصان نہ اٹھائے اور چونکہ باپ اپنی زندگی کے آخری حصے میں یہ وصیت کر رہا ہے اور وہ ان تمام تجربات سے خود گزر چکا ہے اس لئے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بیٹے کو باپ کی تعلیم کی روشنی میں جوانی ہی میں بعض ایسی باتیں بھی معلوم ہو جائیں جو باپ کو اپنی جوانی کے زمانے میں معلوم نہ ہوں۔ کیونکہ اس نے تجربے سے انہیں حاصل کیا ہے اور اب اپنے تجربات کا نچوڑ بیٹے سامنے پیش کر رہا ہے۔

گویا امیر المومنینؑ دنیا کے تمام والدین کو ایک درس دے رہے ہیں کہ

ہر باپ دنیا سے جانے سے قبل اپنے تجربات اپنی اولاد تک منتقل کر دے تاکہ اولاد جب کارگاہ حیات میں قدم رکھے تو اس کے پاس ماضی کے ایسے تجربات موجود ہوں جن کی روشنی میں اپنے مستقبل کو زیادہ بہتر بنا سکے اور اولاد بھی ان نصائح کو اِس جذبے کے ساتھ سنے اور قبول کرے کہ یہ سارے پند و نصائح اُس کی اپنی زندگی کے لئے چراغ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور اگر اس نے ان نصائح کو پیش نظر رکھا تو اُن بہت سے نقصانات سے محفوظ رہے گا جو ناتجربہ کاری کی بنا پر پیش آتے ہیں اور اِس کے ساتھ اولاد اِس بات کو بھی پیش نظر رکھے کہ والد کی طرف سے اپنے تجربات کی جو سوغات اُسے کسی زحمت و مشقت کے بغیر مل رہی ہے اِس کے لئے خود باپ نے کتنی زحمتیں اٹھائی ہوں گی ۔

اس لئے اسے اس سوغات کی قدر کرنی چاہئے اور اپنی غفلت ولاپرواہی سے اسے ضائع و برباد نہیں ہونے دینا چاہئے کیونکہ یہ سوغات اگرچہ بیٹے کو آسانی سے، بلا قیمت مل رہی ہے لیکن درحقیقت اس میں باپ کا خونِ جگر ملا ہوا ہے جس نے اِس سوغات کو انتہائی قیمتی بنا دیا ہے

ماضی کے مشاہدات

حضرت امیر المومنینؑ فرماتے ہیں ۔

" اے نورِ نظر! مجھے ماضی کے سن رسیدہ اشخاص جیسی طولانی زندگی تو نہیں ملی ۔ تاہم میں نے ان کی کارگزاریوں کا جائزہ لیا ۔ اُن کے حالات و واقعات پر غور کیا اور اُن کے چھوڑے ہوئے نقوش کو اس طرح پرکھا کہ اُن کی زندگی آئینہ کی طرح میرے سامنے آگئی اور اب اُن کی ہر بات اِس طرح میرے مشاہدے میں ہے گویا میں بھی ان ہی کا ساتھی ہوں بلکہ اُن کے حالاتِ زندگی میرے سامنے اِس طرح عیاں ہیں گویا میں نے ان کے اول سے لے کر آخر تک ہر ایک کے ساتھ زندگی گزاری ہے اس لئے میرا علم و تجربہ کسی ایک زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ابتداء سے لے کر آج تک کے تمام انسانوں کی زندگی گویا میرے سامنے ایک کھلی ہوئی کتاب

کے مانند ہے۔ چنانچہ میں نے صاف و شفاف چیزوں کو گندی چیزوں سے اور منفعت بخش اشیاء کو نقصان دہ اشیاء سے الگ کر کے پہچان لیا ہے اور اب ان تمام چیزوں کا نچوڑ تمہارے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ میرے علم و تجربہ میں جتنی باتیں آئیں ان میں سے خوبیوں کو چن چن کر تمہارے لئے یکجا کر دیا ہے اور بے معنی چیزوں کو الگ گویا فرماتے ہیں۔ مجھے ماضی کے تمام لوگوں کے حالات و تجربات کا علم ہے اور میں ان کی مفید و مضر، کھری اور کھوٹی، اچھی اور بری نفع بخش، اور نقصان دہ ساری باتوں کو جانتا ہوں۔ لیکن ان تمام باتوں میں سے جو صاف ستھری عمدہ، نفع بخش اور خوبیوں کا مجموعہ ہیں اُن ہی کو اس وصیت نامہ میں پیش کر رہا ہوں تاکہ وصیت نامہ ہر لحاظ سے نیکیوں کا خزینہ ہو۔ بلکہ حسنات کا ایک ایسا گلدستہ بن جائے جس کی خوشبو سے تمام بنی نوع انسان معطر ہوں۔ یہ ایک ایسا چراغ ہو جس کی روشنی میں قافلۂ انسانیت منزل مقصود کی طرف تیزی سے گامزن نظر آئے۔

پھر فرمایا

"اے لخت جگر چونکہ مجھے تمہاری ہر بات کا اتنا ہی خیال ہے جتنا ایک شفیق و کریم باپ کو اپنے عزیز و محبوب بیٹے کا ہونا چاہئے اور اسی کے ساتھ تمہیں صفاتِ حسنہ کے ذریعہ سنوارنا بھی میرے پیش نظر ہے، اس لئے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ یہ تعلیم و تربیت اس حالت میں ہو کہ تم ابھی نوعمر اور بساط دہر پر تازہ وارد ہوئے ہو تمہاری نیت صاف اور تمہارا نفس پاکیزہ ہے (کیونکہ نصیحت کی باتوں کو وہی قبول کرتا ہے جس کی نیت صاف اور نفس پاکیزہ ہو)

اور میں نے چاہا تھا کہ سب سے پہلے تمہیں کتاب الٰہی، اس کی تنزیل و تاویل، اسلامی شریعت کے آداب و احکام، حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تفصیلات سے آگاہ کر دوں اور اس کے علاوہ دوسری چیزوں کی طرف رخ نہ کروں بلکہ ان ہی مذکورہ بالا امور کو تمہارے ذہن میں راسخ کرنے پر توجہ دوں۔ لیکن یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں وہ باتیں جن میں لوگوں کے نظریات و مذہبی خیالات میں اختلاف ہے وہ

تمہارے لئے بھی اسی طرح ذہنی الجھن اور پیچیدگی کا سبب نہ بنیں جس طرح ان لوگوں کے لئے الجھن کا سبب بنی ہے اور کہیں حقیقت حال تمہارے لئے بھی اسی طرح مشتبہ نہ ہو جائے جس طرح ان لوگوں کے لئے مشتبہ ہوئی ہے۔

اور باوجودیکہ ان غلط افکار و نظریات کا تمہارے سامنے تذکرہ کرنا مجھے پسند نہ تھا۔ (کہ تم ان الجھنوں میں کیوں دخیل ہو) تاہم مجھے مناسب معلوم نہ ہوا کہ میں تمہیں اس طرح ان نظریات و افکار کے حوادث کے سپرد کر دوں جس سے تمہاری ہلاکت و بربادی کا خطرہ لاحق ہو جائے اس لئے مجھے یہی بہتر معلوم ہوا کہ میں تمہارے لئے عقائد و نظریات اور افکار و خیالات کے اس پہلو کو بھی مضبوط کر دوں (تا کہ تمہارے افکار و خیالات میں ایسی پختگی پیدا ہو جائے کہ لوگوں کے عقائد و نظریات کی لغزشیں کسی مرحلہ پر بھی تمہیں متاثر نہ کر سکیں۔ اور مجھے امید ہے کہ پروردگار عالم تمہیں نیکی کے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے گا اور سچے راستے کی طرف تمہاری رہنمائی کرے گا اور اسی امید پر میں یہ وصیت تمہارے نام لکھ رہا ہوں۔

اے میرے نور نظر یاد رکھو کہ میری اس وصیت سے جن باتوں کی پابندی میں تمہارے لئے سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں وہ تقویٰ ہے۔ اور یہ کہ پروردگار عالم نے جو فرائض تم پر عائد کئے ہیں ان کی پابندی کرو۔ اور نیکی کے جس راستے پر تمہارے آباء و اجداد اور تمہارے خاندان کے صالح افراد چلتے رہے ہیں اسی پر تم بھی گامزن رہنا کیونکہ جس طرح تم اپنے لئے غور و فکر کر سکتے ہو اسی طرح انہوں نے بھی غور و فکر کیا۔ اور جس طرح تم دور اندیشی کی راہ اختیار کر سکتے ہو اسی طرح انہوں نے بھی دور اندیشی کو ملحوظ رکھا، مگر انتہائی غور و فکر کے بعد بھی وہ اسی نتیجہ تک پہنچے کہ انہیں جو فرائض معلوم ہیں ان کو انجام دیں اور غیر متعلق باتوں سے کنارہ کش رہیں۔ لیکن اگر تمہارا ضمیر اس پر آمادہ نہ ہو کہ ذاتی تحقیق کے بغیر کسی بات کو قبول کرے اور جس طرح ان لوگوں نے اپنی جد و جہد سے حاصل کیا تھا۔ اسی طرح جد و جہد کر کے معرفت حاصل کرے۔ تو یہ بہر حال ضروری ہے کہ تمہارا انداز فکر و نظر سیکھنے اور سمجھنے کا ہو۔ شبہات میں کود پڑنے اور بحث و نزاع میں الجھنے کا انداز نہ ہو۔

اور اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی چیز کی تحقیق کے لئے بے مہابا چل پڑو، نہیں بلکہ اس کے بھی کچھ آداب و شرائط ہیں جنہیں پیش نظر رکھنے والا کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے اور نظر انداز کرنے والا اپنے آپ کو تھکا لیتا ہے۔

تو اس صورت حال سے بچنے کے لئے اور معرفتِ حق سے قریب ہونے کے جو آداب ہیں اُن میں سب سے پہلا ادب یہ ہے کہ "فکر و نظر اور تلاش و جستجو شروع کرنے سے پہلے پروردگار عالم سے مدد کے لئے درخواست کرو تاکہ وہ اپنی توفیقات کو تمہارے شامل حال رکھے" کیونکہ دین و مذہب کے سلسلے میں فہم و فراست اس وقت تک حاصل ہی نہیں ہو سکتی جب تک پروردگار عالم کی خصوصی عنایت اور توفیق شامل حال نہ ہو۔

امیر المومنینؑ نے اپنے اس جملے میں دنیا بھر کے تشنگانِ علم و معرفت کے لئے ایک عظیم نصیحت فرمائی ہے کہ اگر واقعتاً راہِ حق کو پہچاننا چاہتے ہو اور اس بات کے آرزومند ہو کہ معرفت کے ابواب ان پر روشن ہو جائیں تو اس کے لئے پہلے اپنے نفس کی ریاضت کرو تاکہ خداوند عالم کی طرف کامل توجہ پیدا ہو اور جب نفس اتنا مرتاض ہو جائے کہ پروردگار عالم کی طرف کامل توجہ پیدا ہو جائے تو پھر اُسی بارگاہِ بے نیاز میں درخواست پیش کرے کہ اے پالنے والے حق کو پہچاننے میں میری امداد فرما۔ اور اگر اس جملہ کو وسیع تر مفہوم کے لحاظ سے دیکھا جائے تو دنیا بھر کے اُن تمام طالب علموں کے لئے جو حق و حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہیں مولا کے جملوں میں یہ درس پوشیدہ ہے کہ اگر کوئی علمی مفہوم ان کی نظروں سے اوجھل ہو جائے یا کسی علمی باب کو سمجھنے میں دشواری پیش آئے تو خلوص نیت کے ساتھ بارگاہ معبود میں دعا کریں کہ پالنے والے اس مطلب کو سمجھنا میرے لئے آسان فرما تو اگر اُن کی طلب سچی اور نیت خالص ہے تو گتھی ضرور سلجھ جائے گی اور مشکل سے مشکل مطلب بھی سہولت سے ذہن نشین ہو جائے گا۔

امیر المومنینؑ اخلاصِ نیت کے ساتھ تحقیقِ حق کے لئے ایک اور شرط بیان فرماتے ہیں

" ہر اس وہم کے شائبہ سے اپنا دامن بچاؤ جو تمہیں شک وشبہ میں ڈال دے یا تمہیں گمراہی کی طرف پہنچا دے ۔"

گویا یہ تحقیق حق کی دوسری اہم شرط ہے کہ اپنے ذہن کو بالکل آئینہ کی طرح صاف وشفاف رکھیں تاکہ حق کی تصویر اس پر مرتسم ہو سکے کیونکہ آئینہ جس قدر شفاف ہوگا تصویر اتنی ہی عمدہ نظر آئے گی ۔ اسی طرح ذہن کا آئینہ اوہام وشبہات سے جتنا پاک ہوگا تلاشِ حقیقت اتنی ہی آسان بھی ہوگی اور تصویرِ حق اتنی ہی نمایاں بھی ہوگی ورنہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اوہام وشبہات کی یلغار منزلِ حق تک پہنچنا دشوار بنا دیتی ہے اور انسان اپنی ذہنی الجھنوں سے نکلنے ہی نہیں پاتا ۔

امیر المومنینؑ فرماتے ہیں کہ تلاش حقیقت کے لئے اوہام سے چھٹکارا حاصل کرو اور خلوص قلب کے ساتھ اپنے پروردگار سے التماس کرو کہ وہ حق تک پہنچنے کی توفیق دے پھر تم دیکھو گے کہ حقیقت کو سمجھنا تمہارے لئے آسان ہو جائے گا ۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ۔

" جب تمہیں یقین ہو جائے کہ تمہارا دل صاف ہو گیا ہے اور اس میں اثر قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے اور ذہن پورے طور پر یکسوئی کے ساتھ تیار ہے اور تمہارا ذوق وشوق ایک نکتہ پر جم گیا ہے ۔"

بالفاظ دیگر جب اوہام سے چھٹکارا حاصل کرنے اور پروردگارِ عالم سے توفیق خیر کی دعا کرے اور نیت میں خلوص پیدا کر کے بارگاہِ معبود میں التجا کرنے سے دل کو یہ اطمینان پیدا ہو جائے کہ میں واقعاً حق کو سمجھنا چاہتا ہوں اور معرفت کے علاوہ میرا کوئی اور مقصد نہیں ہے ، بلکہ میں دل وجان سے یہ چاہتا ہوں کہ حق تک رسائی حاصل کروں اور جو باتیں مجھے صراطِ مستقیم پر گامزن رکھنے والی ہیں ان سے پوری طرح واقف ہو جاؤں تاکہ کارزارِ حیات میں میرے قدم ڈگمگانے نہ پائیں ، میں اپنی کم علمی سے کہیں باطل کی حمایت نہ کرنے لگوں ، کہیں اپنی ناسمجھی سے حق سے دور نہ ہو جاؤں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس راستے پر چلنے لگوں جو مجھے منزلِ مقصود سے دور کر دے ۔

امیر المومنین فرماتے ہیں کہ ”جب صدق دل سے حق کو پہچاننے کی جستجو پیدا ہو جائے تو ان باتوں پر غور کرنا جو میں نے تمہارے سامنے بیان کی ہیں۔ کیونکہ ان مطالب سے صحیح طور پر وہی شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جو قلب کی پاکیزگی اور ضمیر کی صداقت کے ساتھ ان پر غور کرے اور تلاش حق کی نیت سے ان میں اپنی جستجو کو کام میں لائے۔ لیکن اگر تمہارے حسب منشا دل کی یکسوئی اور فکر و نظر کی آسودگی حاصل نہیں ہوئی ہے اور تمہارے خیالات پراگندہ اور افکار منتشر ہیں تو یہ سمجھ لو کہ معرفت حق کے جو دو بنیادی آداب ذکر کئے گئے تھے اُن کی ابھی تم نے تکمیل نہیں کی ہے یعنی اوہام سے چھٹکارا حاصل کرنا اور ذات پروردگار سے خلوص نیت کے ساتھ رجوع کرنا جس کے بعد حق کی معرفت آسان اور اس کے راستے پر چلنا سہل ہو جاتا ہے۔ اور انسان ذہنی پراگندگی سے نجات حاصل کر لیتا ہے لیکن ابھی تم اس منزل تک نہیں پہنچے ہو تو

یہ سمجھ لو کہ ابھی تم شب کور اونٹنی کی طرح ہو پیر مار رہے ہو اور ظلمتوں میں بھٹک رہے ہو اور ظاہر ہے کہ جو حق کو پہچان لے اس کی یہ کیفیت نہیں رہتی بلکہ حق تک پہنچنا تو ایسا ہے جیسے رات کے بعد دن ہو جانا اور ظلمت شب کو تار تار کرتے ہوئے آفتاب عالم تاب کا صحن عالم میں جلوہ گر ہو جانا چنانچہ امیر المومنین ارشاد فرماتے ہیں کہ۔

”جو دین کی حقیقت کا طلبگار رہو وہ تاریکیوں میں ہاتھ پیر نہیں مارتا اور نہ غلط بحث کرتا ہے۔ بلکہ استقامت فکر کے ساتھ حق و صداقت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ ظلمت مٹ جائے اور حقیقت روشن ہو کر اس کی نگاہوں کے سامنے آجائے

گویا آپ فرماتے ہیں کہ جو شخص حق و حقیقت کا طلبگار ہے اس کی نگاہ تو موتیوں پر ہونی چاہئے کہ کہاں حکمت کے موتی مل رہے ہیں جن سے اپنے دامن کو بھر سکے، اور کہاں خوشبوؤں کی مہک ہے کہ اپنی مشام جان کو معطر کر سکے نہ یہ کہ کانٹوں سے الجھ کر رہ جائے اور خار دار وادیوں سے اپنا دامن سمیٹ کر صحیح سالم گزر جانے کے بجائے

جلد بازی اور نا سمجھی میں اپنے ہی دامن کو تار تار کرلے۔ البتہ اگر تلاش حقیقت کے سلسلہ میں ایسی کوئی راہ آ ہی جائے جہاں خار دار جھاڑیاں ہوں اور دامن کے الجھ جانے کا خطرہ ہو تو ایسے مواقع پر بے سوچے سمجھے کود پڑنا مناسب نہیں ہے بلکہ " ایسے مواقع پر اپنے دامن کو سمیٹ لینا، اور گمراہی کی وادیوں سے اپنے کو بچا لینا ہی بہتر ہے۔"

مالک دو جہاں

" میری وصیت کو سمجھو۔ اور یہ یقین رکھو کہ جس کے قبضۂ قدرت میں موت ہے اسی کے اختیار میں زندگی بھی ہے وہی پیدا کرنے والا بھی ہے اور موت سے ہمکنار کرنے والا بھی، جو فنا کرنے والا ہے وہی دوبارہ حیات نو عطا فرمانے والا ہے اور جو آزمائشوں میں مبتلا کرنے والا ہے وہی ان آزمائشوں سے نجات بھی دینے والا ہے۔

لہٰذا اس یقین کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان نہ مایوس ہو نہ مغرور نہ زندگی پر فخر کرے اور نہ موت سے بے پرواہ ہو اور اگر ظاہری طور پر موت کے آثار نظر آنے لگیں تب بھی مایوسی کا شکار نہ ہو کیونکہ دنیا والوں کے ہاتھ میں نہ کسی کی زندگی ہے نہ موت، بلکہ خدا ہی ہے جو زندگی بھی عطا کرنے والا ہے اور موت بھی اور جب تک اس کی طرف سے کسی کی موت کا وقت مقرر نہ ہو چکا ہے کوئی کسی کو مار نہیں سکتا اور اگر اس کی طرف سے فیصلہ ہو چکا ہو تو کوئی کسی کو بچا نہیں سکتا۔ کیونکہ اسلامی عقیدے کی رو سے زندگی اور موت کا اختیار اللہ ہی کو ہے۔ اس لئے مومن نہ حالات کے خوشگوار ہونے سے فخر و غرور میں مبتلا ہو۔ نہ حالات کی سختی سے مایوس و نا امید ہو بلکہ ہر حالت میں حق کی تلاش جاری رکھے اور حق کا راستہ پہچان لینے کے بعد اسی پر گامزن رہے اور تنگدستی و خوشحالی، امن و امان اور بدامنی غرض ہر حال میں اپنی جان کا مالک خالق دو جہاں کو سمجھے، جو اسی کی امانت ہے اور اس کی مرضی اور حکم کے بغیر خرچ نہیں کی جا سکتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ خودکشی کو حرام قرار دیا گیا اور ایسی جگہ ٹھہرنا بھی ناجائز قرار دیا گیا جہاں ٹھہرنے سے جان و مال اور عزت و آبرو کو خطرہ ہو اور حکم خدا و رسول یا فرمان امام کے بغیر جہاد کو ساقط قرار دیا گیا کیونکہ خدا و رسول اور امام معصوم ہی

نتائج وعواقب سے صحیح طور پر واقف ہیں۔ اور جب وہ حکم دیں تو انسان کو یقین ہوگا کہ وہ صراط مستقیم کا مزن ہے اب اس راستہ میں اگر وہ فاتح وظفریاب ہوتا ہے تو غازی ہے اور اگر مقتول ومجروح ہوتا ہے تو شہادت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ لیکن جب تک رسولؐ وامامؑ کا حکم نہ ہو اس وقت تک جہاد حرام قرار دیا گیا ہے کہ اس صورت میں انسان کو یقین نہیں ہو سکتا کہ جان جیسا عظیم اور قیمتی نذرانہ کسی کی بارگاہ میں پیش کر رہا ہے اور اگر ایسی صورت میں، انسان کسی موقع پر دشمنوں میں گھر جائے تو جس صورت سے بھی ممکن ہو اپنی جان بچانے کی کوشش کرنا واجب ہے۔ اس کے لئے اگر سامنے آکر مقابلہ کرنا ممکن ہو تو مقابلہ کرے اور اگر سامنے آکر مقابلہ کرنا ممکن نہ ہو اور سامنے سے ہٹ کر مخفی طور پر مدد پہنچا سکتے ہو تو دشمن کے سامنے سے ہٹ جاؤ اور چھپ کر مدد پہنچانے کی کوشش کرو جیسا کہ قرآن مجید میں خالق دوجہاں کا ارشاد ہے کہ۔

یاایھا الذین اٰمنوا اذا لقیتم الذین کفروا زحفا فلا تولوھم الادبار ومن یولھم یومئذ دبرہ الا متحرفا لقتال او متحیزا الی فئۃ ۔

(اے صاحبان ایمان، جب کافروں سے معرکہ آرائی ہو تو پیٹھ نہ پھیرنا ہاں البتہ، اگر جنگ کی حکمت عملی یا معاون گروہ کی پشت پناہی کے لئے پیٹھ پھیر کر جانا پڑے (تو کوئی حرج نہیں ہے)۔

تو قرآن مجید نے مقابلے کے موقع پر ہٹ جانا صرف دو صورتوں میں جائز قرار دیا ہے (۱) جنگ کی حکمت عملی کا یہ تقاضہ ہو کہ سامنے سے ہٹ جایا جائے اور (۲) جو گروہ محاذ پر ہے وہ کمزور پڑ جائے اور دوسری جگہ کوئی ایسا گروہ ہو جو معاون ثابت ہو سکتا ہو تو اس معاون گروہ کا تعاون حاصل کرنے کے لئے اگر محاذ سے ہٹنا پڑے تو انسان ہٹ جائے۔ اور اس معاون گروہ کی پشت پناہی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اور بہرحال انجام کار سے تو خداوند عالم ہی باخبر ہے، وہی نیت کی سچائی اور دل کی حالت سے واقف ہے۔

چنانچہ امیرالمومنینؑ ارشاد فرماتے ہیں۔

"اور دنیا کا نظام بہرحال وہی رہے گا جو خداوند عالم نے اس کے لئے مقرر کر رکھا

ہے ۔ نعمتوں کا عطا کرنا، یا آزمائشوں میں مبتلا کرنا اور آخرت میں جزا دینا، یا جو کچھ بھی اُس کی مشیت میں ہو اور ہم بندوں کے علم میں نہ ہو، سب کچھ اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے ۔ وہ جسے نوازنا چاہے اسے کوئی نہیں روک سکتا ۔ اور جسے محروم کرنا چاہے اسے کوئی عطا نہیں کر سکتا ۔ اسی طرح وہ جسے چاہتا ہے آزمائشوں اور امتحان میں ڈالتا ہے ۔ بندے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ آزمائش ان کے لئے بلا ہے، جبکہ درحقیقت ان کا امتحان ہوتا ہے تاکہ یہ آشکار ہو جائے کہ کون آزمائشوں میں بھی اسے یاد رکھتا ہے اور کون اس کا شکوہ شروع کر دیتا ہے ۔ اور اسی لئے ہر انسان کا امتحان اس کی طاقت و برداشت کے مطابق ہوتا ہے ۔ چنانچہ کائنات میں سب سے سخت امتحان حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کا تھا ۔ اور ان بھی جو فضل و شرف کے لحاظ سے سب سے برتر تھے ان کا امتحان بھی سب سے سخت تھا ۔ جیسا کہ حضرت خاتم الانبیاءؐ کی حدیث ہے کہ ۔ "ما اوذی نبی قط کما اوذیت" جتنی سخت اذیتیں مجھے پہنچائی گئیں، اور آپؐ کا خاندان جو کائنات میں سب سے اعلیٰ خاندان تھا اس کے افراد کو سب سے زیادہ سخت آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا ۔ اور پھر دنیا نے دیکھا کہ ان مقدس ہستیوں نے آزمائشوں کو ایسی خندہ پیشانی سے قبول کیا کہ ظالم ظلم کرتے کرتے تھک گیا، مگر ان کے صبر و استقامت میں فرق نہ آیا ۔ اور اسی طرح ان کے چاہنے والوں میں جس کا رتبہ جتنا بلند تھا ۔ اتنا ہی اس کا امتحان بھی سخت تھا ۔ جن کی مثالوں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں ۔ لہٰذا اگر انسان اس دنیاوی زندگی میں کسی آزمائش میں پڑ جائے تو خالق دوجہاں کا شکوہ کرنے کے بجائے اس کی مشیت کے آگے سرنگوں رہنا چاہئے اور اگر اس آزمائش و امتحان کی مصلحت وقتی طور پر سمجھ میں نہ آئے تو بھی پروردگار کی حکمت و مصلحت پر پورا اعتماد رکھنا چاہئے ۔ چنانچہ امیر المومنینؑ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ۔

"اگر مصالح خداوندی میں سے کوئی بات تمہاری سمجھ میں نہ آئے اور ذہن کسی گتھی میں الجھ جائے تو اسے اپنی لاعلمی پر محمول کرو کیونکہ پہلے پہل، جب تم پیدا ہوئے

تھے تو ہر بات سے لاعلم تھے پھر رفتہ رفتہ تم نے چیزوں کو سمجھنا شروع کیا۔ اور ابھی بکثرت ایسی باتیں ہیں جن سے تم ناواقف ہو۔ جن میں تمہارا ذہن پریشان رہتا ہے اور نظریں بھٹکتی رہتی ہیں پھر آہستہ آہستہ تم ان باتوں کو بھی سمجھنے لگتے ہو"۔ امیر المومنین کا یہ ارشاد تخلیق انسان کے اس تصور کے عین مطابق ہے جو قرآن مجید نے پیش کیا ہے چنانچہ سورہ مبارکہ النحل میں ارشاد قدرت ہے۔

واللّٰہ اخرجکم من بطون امھاتکم لا تعلمون شیئاً۔

پروردگار عالم نے تمہیں بطن مادر سے دنیا میں بھیجا اس حالت میں کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے ملاحظہ ہو پارہ ۱۴، سورہ ۱۶، آیت ۷۸۔

اور مشاہدہ بھی اس بات کی بھرپور تصدیق کرتا ہے کہ انسان کس طرح رفتہ رفتہ رشد و ہدایت و کمال سے آشنا ہوتا ہے لہٰذا اگر ایک بیٹا جس نے ابھی اپنی زندگی کی طرف چند منزلیں طے کی ہیں اور اس کا ذہن حقائق اشیاء تک نہیں پہنچا ہے تو اسے ان چیزوں کا نہ تو انکار کرنا چاہیے جن سے ناآشنا ہے اور نہ ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لینا چاہیے بلکہ اپنی ابتدائی حالت پر غور کرنا چاہیئے جب وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ اور اس دور کو یاد کرنا چاہیئے جب ایک ایک لفظ کو یاد کرنے میں اسے سخت مشقت اٹھانی پڑتی تھی۔ اور خداوند عالم کے انعامات و احسانات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے انسان کو قوت نطق و بیان سے نوازا چنانچہ سورہ رحمٰن جس میں قدم قدم پر اللہ نے اپنی نعمتوں کا تذکرہ کیا ہے اور گروہ جن و بشر سے سوال کیا گیا ہے کہ تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے، اس کے بالکل آغاز میں ارشاد فرمایا ہے۔

الرحمٰن علم القرآن خلق الانسان علمہ البیان۔

رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی، انسان کو پیدا کیا اور اسے بیان کا طریقہ سکھایا۔

تو یہ اس کا لطف و کرم ہے کہ اس نے انسان کو قوت گویائی عطا کی جس کے ذریعہ وہ اپنے مقاصد کا اظہار کرتا ہے اور اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے لب کشائی کرتا ہے اور پھر جیسے جیسے علم و کمال سے آراستہ ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے یہ

قوت گفتار بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اور ایک منزل ایسی بھی آجاتی ہے کہ اس کی گفتگو سننے کے لئے ہزاروں افراد سیل رواں کی طرح امنڈتے چلے آتے ہیں۔ اسی لئے عربی زبان کی مثل مشہور ہے کہ،

ان من البیان سحرا۔ بعض باتیں اپنے اندر جادو جیسا اثر رکھتی ہیں) اگرچہ یہ جادو، محاورہ والا جادو ہے لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ بعض تقریروں میں بڑا اثر ہوتا ہے اور بعض لوگ اپنی "جادو بیانی" سے قوموں کے اندر انقلاب برپا کر دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس قوت گفتار کی کرشمہ سازی ہے جو خالق دوجہاں نے عطا فرمائی ہے۔ لہٰذا جن لوگوں کو یہ قوت ملی ہے وہ اس پر خدائے کون ومکاں کا شکر ادا کریں اور اس کے شکر کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اپنی قوت گفتار کو ان امور میں صرف کریں جو خدا و رسولؐ اور ائمہ طاہرینؑ کو پسند ہوں اور جس سے بنی نوع انسان کی سیرت وکردار کی تعمیر ہو سکے۔

اس کے بعد امیر المومنینؑ فرماتے ہیں۔

اس خالق دوجہاں سے اپنے آپ کو وابستہ رکھو اور اس کے احکام کا اتباع کرو) جس نے تمہیں پیدا کیا، تمہیں رزق عطا فرمایا اور تمہارے اعضار جوارح میں توازن قائم کیا۔ لہٰذا صرف اسی کی عبادت کرنا، اسی کی بارگاہ میں اپنی درخواست پیش کرنا، اسی کی طرف راغب رہنا) اور بس اسی سے ڈرتے رہنا"۔

چنانچہ سورہ مبارکہ الانفطار میں ارشاد قدرت ہے۔

یا ایھا الانسان ما غرک بربک الکریم الذی خلقک فسوٰک فعدلک۔ فی ای صورۃ ما شاء رکبک۔

اے انسان۔ وہ کونسی بات ہے جو تجھے اپنے اس پروردگار سے منحرف کر رہی ہے جو صاحب لطف وکرم ہے جس نے تجھے پیدا کیا، تیرے جسم کو جیسا چاہا تیری صورت بنا دی) پارہ ۳۰ سورہ ۸۲ آیت ۲ ، ۸

گویا اگر انسان اللہ کی تمام نعمتوں سے آنکھیں بند کرلے اور صرف اپنے وجود

پر غور کرے کہ کونسی ایسی ہستی ہے جس نے مجھے پیدا کیا۔ میرے اعضاء جوارح بنائے، ان اعضاء و جوارح میں اعتدال رکھا اور ان کو ایسے پیکر میں خلق فرمایا جو بہترین اور متوازن ترین پیکر ہے۔ تو اس کے دل سے اور ضمیر سے خود ہی آواز آئے گی کہ یقیناً وہی ہستی مالک کائنات ہے اور میری جبین نیاز اسی کی بارگاہ میں خم ہونی چاہیے جو میری ابتدا کا بھی مالک ہے انتہا کا بھی۔

پھر امیر المومنینؑ نے فرمایا

"اے نور نظر! تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کسی ایک شخص نے بھی پروردگار عالم اور اس کی تعلیمات کو اس طرح نہیں پیش کیا ہے جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے پیش فرمایا (اور یہ چیز تم سے تقاضہ کرتی ہے کہ) ان کو بطیب خاطر اپنا قائد، پیشوا اور نجات کا رہبر و رہنما تسلیم کر لو (اور یہ یاد رکھو کہ) میں تمہیں پر خلوص نصیحت کرنے میں ہرگز کوتاہی نہیں کروں گا (اور یہ حقیقت ہے کہ) تم اپنی تمام جدوجہد کے باوجود اپنے سود و بہبود کے بارے میں اس حد تک غور نہیں کر سکتے ہو جتنا میں کر سکتا ہوں" کیونکہ تمہارے تجربات تمہارے سن و سال کے اعتبار سے محدود اور میرے تجربات تمہاری بہ نسبت بہت زیادہ وسیع ہیں۔

ان مذکورہ بالا جملوں میں مولا نے دو اہم باتوں کی نصیحت فرمائی ہے۔

(۱) یہ کہ کائنات انسانی میں خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کی ہدایات و تعلیمات سب سے ارفع و اعلیٰ ہیں۔ اور دنیا کے عام انسانوں کا کیا تذکرہ صف انبیاء میں بھی ان کی کوئی مثال نہیں ہے۔ بلکہ آپ کی ذات والا صفات معراج کمال کی اس انتہا پر ہے۔ کہ پروردگار عالم نے ارشاد فرمایا۔

لولاک لما خلقت الافلاک۔

(اے پیغمبرؐ! اگر تم نہ ہوتے تو میں کائنات کو نہ پیدا کرتا۔)

اور اسی کے ساتھ آپ کی ہدایات و تعلیمات بھی اتنی جامع، ہمہ گیر اور آفاقی ہیں کہ آپ پر نازل ہوئی شریعت آخری شریعت قرار دی گئی ہے، اور اب قیامت تک

نہ کوئی نبی آئے گا نہ کوئی اور شریعت بھیجی جائے گی بلکہ اسی شریعت کے قوانین ہر دور کے تمام انسانوں پر نافذ العمل رہیں گے ۔

جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ذہن انسانی ارتقاء کمال کے کسی درجے تک بھی پہنچ جائے ، اور علم و فن کی دنیا میں کتنی ہی بلند پروازیاں دکھائے ، لیکن وہ شریعت خاتم المرسلین کے زیر نگیں رہے گا اور آنحضرتؐ کے احکام و فرامین کو ہر دور میں تمام اصولوں و قوانین پر بالادستی حاصل رہے ۔ کیونکہ آنحضرتؐ کی شریعت کے اصول اتنے جامع ہیں کہ خواہ سابق کا پتھروں کا دور ہو یا آج کا ایٹمی زمانہ ۔ اور چاہے سائنسی اعتبار سے انسان مستقبل میں کتنی ہی ترقی کر لے ، مگر اسلامی شریعت اور اس کے اصول و قوانین کی اسے ہر حال میں ضرورت رہے گی ، کیونکہ یہی قوانین سبیل ہدایت اور طریق نجات ہیں ! ۔

(۲) (اسی کے ساتھ) دوسری بات حضرت امیر المومنینؑ نے یہ فرمائی کہ وہ ماں باپ جو حق و صداقت کے راستے پر گامزن ہیں ۔ ان کے فرزندوں کو چاہیے کہ اپنے والدین کی ہدایات کو صدق دل سے قبول کریں ، بلکہ اسے اللہ کا ایک عطیہ عظیمہ سمجھیں ۔ کیونکہ وہ باپ جس نے پوری زندگی حق کے راستہ پر گامزن رہتے ہوئے گزاری ہے اس کے پاس دینی تعلیمات کے ساتھ ساتھ زمانہ کے تجربات کا بھی ایک گراں بہا خزانہ موجود ہے جس سے اولاد کو کسب فیض کرنا چاہیے ، اور اگر باپ خلوص نیت کے ساتھ اسے نیکی کی ہدایت کر رہا ہے تو اسے ایک گراں بہا تحفہ کی حیثیت سے قبول کرنا چاہیے ۔

کیونکہ باپ محض خلوص نیت کی بناء پر اپنی زندگی بھر کے تجربات کا نچوڑ اولاد کے دامن میں انڈیل رہا ہے اور اولاد کو زمانے کی ان تمام سختیوں سے بچانا چاہتا ہے جنہیں اس نے برداشت کرنے کے بعد ان تجربات کو حاصل کیا ہے ۔

اور کسی بیٹے کو یہ نہ سوچنا چاہیے کہ " باپ جو کچھ کہہ رہا ہے پرانی باتیں ہیں " کیونکہ ماضی کی ان ہی داستانوں میں مستقبل کے ایسے ایسے نشانات موجود ہیں جنہیں بیٹے

نظر رکھنے والا فرزند اپنی آئندہ زندگی میں ان گنت خطرات اور مشکلات سے محفوظ رہ سکتا ہے ۔

پسند و ناپسند

امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں ۔

" اے نور نظر ، لوگوں کے معاملات کے سلسلہ میں اپنی ذات کو میزان بناؤ جو بات اپنے لئے پسند کرتے ہو اسی کو دوسروں کے لئے بھی پسند کرو اور جو چیز تمہیں اپنی ذات کے لئے ناپسند ہو اسے دوسروں کے لئے بھی نہ چاہو ۔ جس طرح تم اس بات کے خواہشمند ہو کہ تم پر کوئی زیادتی نہ کرے ، اسی طرح تم بھی دوسروں پر زیادتی نہ کرو ۔ اور جس طرح تم یہ چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ اچھا سلوک کریں ، تم بھی دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو ۔ اگر کسی کے اندر کوئی عیب ہے اور وہ تمہیں برا معلوم ہوتا ہے تو اسے اپنے اندر کبھی نہ پیدا ہونے دو ، اور لوگوں کے ساتھ تمہارا جو رویہ رہتا ہے اگر وہ بھی تمہارے ساتھ ویسا ہی رویہ رکھیں تو اسے درست سمجھو ۔ جو بات معلوم نہ ہو اس کے بارے میں اپنی زبان نہ کھولو ، کیونکہ جو کچھ تم جانتے ہو وہ بہت کم ہے ۔ خبردار دوسروں کے بارے میں کوئی ایسی بات ہرگز نہ کہو جسے اپنے لئے سننا پسند نہ کرتے ہو اور یہ یاد رکھو کہ خود پسندی ، صحیح طریقہ کار کے خلاف بھی ہے اور عقل کی تباہی کا سبب بھی " ۔

مذکورہ بالا جملوں میں مولائے کائنات نے جو نصیحتیں فرمائی ہیں وہ ہماری معاشرتی زندگی کے لئے ایسی اہم اور لازمی ہدایات ہیں جن پر گامزن ہو کر سماجی زندگی کے ان گنت مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے اور اسی کے ساتھ اگر غور کیا جائے تو حقوق انسانی کا ایک درخشاں باب بھی ہے اور اسلام کی سماجی تعلیمات کا نچوڑ بھی ۔

کوئی بھی انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے اس بات پر آمادہ نہیں ہو سکتا کہ لوگ اسے برا کہیں ، یا اس سے بغض و عناد رکھیں ، یا اس سے بدمزاجی سے پیش آئیں یا پیٹھ پیچھے اس کی برائی کریں یا اس کے ساتھ ترش روئی کا مظاہرہ کریں ، یا اس کے

لئے نامناسب الفاظ استعمال کریں یا اس کے ساتھ بداخلاقی سے پیش آئیں۔ کیونکہ دنیا کا کوئی بھی صاحب عقل و شعور انسان ان باتوں کو پسند نہیں کرتا۔ مولائے کائنات فرماتے ہیں کہ جس طرح تمہیں یہ بات پسند نہیں کہ لوگ تمہارے ساتھ ایسا سلوک کریں۔ اسی طرح تم خود بھی اس بات کی پابندی کرو کہ کسی کی برائی نہ کرو۔ کسی سے بغض و عناد نہ رکھو، کسی سے بدمزاجی کے ساتھ پیش نہ آؤ، پیٹھ پیچھے کسی کی برائی نہ کرو، کسی سے ترش روئی کا مظاہرہ نہ کرو، کسی کے لئے نامناسب الفاظ استعمال نہ کرو اور نہ کسی کے ساتھ بداخلاقی کرو۔ بلکہ جس طرح تم یہ چاہتے ہو کہ لوگ تمہیں اچھا سمجھیں تم سے محبت کریں۔ خندہ پیشانی سے ملاقات کریں، تمہاری عدم موجودگی میں بھی تمہاری تعریف ہی کریں، تم ان کے پاس جاؤ تو خوش ہو کر تمہارا استقبال کریں۔ ہمیشہ اچھے الفاظ سے تمہیں یاد کریں۔ اور تمہارے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آئیں۔

اسی طرح تم بھی انہیں اچھا سمجھو، ان سے محبت کرو، ان سے خندہ پیشانی سے ملاقات، ان کی عدم موجودگی میں بھی ان کا تذکرہ اچھے الفاظ میں کرو۔ اگر وہ تمہارے پاس آئیں تو خوشی کے ساتھ ان کا استقبال کرو انہیں اچھے الفاظ سے نوازو اور ہمیشہ ان کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آؤ۔

پیغمبر اسلام اور ائمہ کرام علیہم السلام کی تعلیمات میں بھی یہ اصول جابجا نظر آتے ہیں۔

”جو بات اپنے لئے پسند کرو وہی دوسروں کے لئے بھی پسند کرو“

اور امام چہارم حضرت زین العابدین علیہ السلام نے ”رسالۃ الحقوق“ میں ”جن ”۵۰“ انسانی حقوق کا تذکرہ فرمایا ہے ان میں بھی سرفہرست اسی بات کو قرار دیا گیا ہے کہ دیکھو جو بات تمہیں اپنے لئے پسند نہ ہو اسے دوسرے کے لئے بھی پسند نہ کرو۔

امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اس سلسلہ میں جامع دستور بتایا کہ دیکھو: جب بھی پسند و ناپسند کا مرحلہ ہو اور تم نہ سمجھ سکو کہ تمہیں اپنے برادر مومن یا کسی عام انسان کے ساتھ کیسا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے اس سے کس طرح گفتگو کرنی

چاہئے، اس کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہئے اور تمہارا رویہ اس کے ساتھ کیسا ہونا چاہئے تو ایسے مواقع پر بہترین طریقہ یہ ہے کہ اپنی ذات کو میزان قرار دو، اور یہ سوچو کہ یہ سلوک خود تمہارے ساتھ ہونے والا ہے، پھر غور کرو کہ تمہارے ساتھ کیسا سلوک ہونا چاہئے۔ لوگوں کو تمہارے ساتھ کیسی زبان استعمال کرنی چاہئے، کس طرح تمہاری پذیرائی کرنی چاہئے اور کس طرح تمہارا استقبال کرنا چاہئے۔ جو خاکہ تمہارے ذہن میں اپنی ذات کے لئے ابھرے اسی خاکہ کو دوسروں کے لئے میزان بنانا چاہئے اور چونکہ دنیا کا کوئی بھی صاحب عقل انسان اپنے لئے کوئی بری بات پسند نہیں کرتا، اس لئے دوسرے کسی انسان کے لئے بھی کسی بری بات کا قصد نہیں کرنا چاہئے۔

اور لفظ "میزان" خاص طور پر قابل غور ہے۔ کیونکہ "میزان" عربی زبان میں ترازو کو کہا جاتا ہے، جو اسی وقت صحیح سمجھی جاتی ہے جب اس کے دونوں پلڑے برابر ہوں گویا حضرت امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ کوئی بھی معاملہ درپیش ہو تمہیں اپنے ذہن میں ایک ترازو کا تصور رکھنا چاہئے۔ جس کا ایک پلڑہ تمہاری ذات ہو اور دوسرا پلڑا دوسرے شخص کی ذات ہو اور یاد رکھو کہ عدل کا تقاضہ یہ ہے کہ دونوں پلڑے بالکل برابر ہوں۔ اور قرآن مجید میں سورہ رحمٰن میں ارشاد قدرت ہے واقیموا الوزن بالقسط ولا تخسروا المیزان۔

ترجمہ:۔ اور وزن کو انصاف کی ترازو پر قائم رکھو اور میزان میں کمی نہ کرو۔

جس طرح کم تولنا بد دیانتی ہے اسی طرح دوسرے انسان کے حق کو پامال کرنا بھی بد دیانتی ہے، اور جس طرح ترازو کا نقص دکاندار کے ایمان اور ضمیر کی کمزوری کی علامت ہے اسی طرح کسی شخص کے انسانی حقوق کو تلف کرنا بھی انسان کے ضمیر و ایمان کی کمزوری کی دلیل ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہئے کہ جس طرح کم تولنا نقص ہے اور جھکا کر تولنا (یعنی خریدار کو اس کے حق سے کچھ زیادہ دینا کمال اور قابل تعریف صفت ہے۔ اسی طرح انسانی حقوق کے سلسلہ میں جب لفظ میزان (ترازو) استعمال کیا گیا تو ممکن

مولائے کائناتؑ اس بات کی طرف اشارہ فرما رہے ہوں۔ کہ کسی کو اس کے حق سے کم دینا تو جرم ہے لیکن اس کے حق سے زیادہ دینا قابل تحسین فعل دینا ، اس لئے جب تم اپنے نفس کو میزان قرار دو تو تمہاری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ دوسرے کا پلڑا بھاری رہے ، یعنی اگر کسی نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہ بھی کیا ہو۔ تو بھی تم اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو ، اگر کسی نے تمہارا حق پامال کردیا ہو تب بھی بہتر بات یہ ہے کہ تم اس کے حق کا خیال کرو اور اگر اس نے تمہارے ساتھ بدزبانی کی ہے تو تم اس کی بدزبانی کو درگزر کر کے اس کے ساتھ خندہ پیشانی کا مظاہرہ کرو۔ کیونکہ یہ عظمت کی علامت ہے ، اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توصیف قرآن کی زبان میں یہ ہے کہ۔

وانک لعلی خلق عظیم۔

ترجمہ :- اے پیغمبر بیشک آپ خلق عظیم پر فائز ہیں)

اس کے ساتھ امیر المومنینؑ نے ایک اور نہایت اہم اور جامع ہدایت فرمائی ہے۔

"جو بات تم نہیں جانتے اس کے بارے میں لب کشائی نہ کرو"۔

اگر ہم اپنی سماجی زندگی کا جائزہ لیں تو اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ لوگوں کے درمیان بے شمار تلخیاں اور گنت رنجشیں غلط فہمیوں کی وجہ سے ہیں اور یہ غلط فہمیاں اسی لئے جنم لیتی ہیں کہ لوگ لب کشائی کے سلسلہ میں احتیاط نہیں کرتے ، بلکہ جو دل میں آیا کہہ گزرتے ہیں اور سنی سنائی باتوں بلکہ محض قیاس آرائی کی بنا پر نتائج قائم کر لیتے ہیں۔

جبکہ قرآن و حدیث کی ہدایات اور ائمہ طاہرینؑ علیہم السلام کی تعلیمات یہ ہیں کہ جب تک کسی شے کے بارے میں علم و یقین نہ ہو جائے لب کشائی نہ کرو۔

لیکن موجودہ صورت حال یہ ہے کہ اگر ایک بدباطن شخص کسی محترم شخصیت کے بارے میں کوئی الزام تراشی کرتا ہے تو بجائے اس کے کہ لوگ اس کو الزام تراشی سے منع کریں ، اور خدا و رسولؐ کا خوف دلائیں بلاتحقیق اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں اور اس کی الزام تراشیوں پر آمنا و صدقنا کہہ کر اسے دوسروں تک پہنچاتے ہیں بلکہ ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ اسے نعوذ باللہ صحیفۂ آسمانی سمجھ کر اس پر یقین کرنا جزو ایمان سمجھتے ہیں جبکہ حقیقی صحیفۂ آسمانی کا فرمان تو یہ ہے کہ

لا تقف مالیس لک بہ علم۔ ان السمع والبصر والفؤاد کل
اولئک کان عنہ مسئولا ۔

" دیکھو خبردار جس بات کا علم و یقین نہ ہو اس کے درپے نہ ہونا کیونکہ روز قیامت آنکھ، کان اور دل ہر ایک سے باز پرس کی جائے گی" آنکھ سے باز پرس ہوگی کہ کن کن چیزوں پر نظر کی، یہ سوچا یا نہیں کہ ان چیزوں کو دیکھنا جائز ہے یا نہیں۔ کان سے باز پرس ہوگی کہ کن باتوں کو سنا، انہیں سننا جائز تھا یا ناجائز اور غلط بات سنی تو تردید کی یا نہیں، دل سے سوال ہوگا کہ کسی کے خلاف کدورت تو نہیں رکھی کسی سے حسد تو نہیں کیا، کسی کے لئے شرعی دلیل کے بغیر عداوت تو نہیں رکھی، کسی کے خلاف غلط منصوبے تو نہیں بنائے کسی کی ہتک عزت پر خوشی تو نہیں منائی ۔

آخرت کی تیاری ۔

اے نور نظر" یاد رکھو۔ تمہیں آخرت کے لئے پیدا کیا گیا ہے دنیا کے لئے نہیں! ۔ تمہیں آخر کار فنا ہونا ہے، باقی نہیں رہو گے اور اس دنیاوی زندگی کا انجام موت ہے نہ کہ حیات" تم ایک ایسی منزل میں ہو جو قابل اعتبار نہیں اور ایک لیے گھر میں ٹھہرے ہوئے ہو جو آخرت کے ساز و سامان کی فراہمی کے لئے ہے اور منزل آخرت کے لئے ایک گزرگاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں موت تمہارا تعاقب کر رہی ہے جس سے کسی کو چھٹکارا نہیں۔ اور کوئی شخص چاہے کتنا ہی اس سے بھاگے وہ اسے اپنی گرفت میں لے کر رہے گی۔ لہٰذا اس بات سے ڈرو کہ موت تمہیں ایسے وقت میں آئے کہ تم توبہ کرنا چاہتے ہو لیکن نہ کر سکو! کیونکہ اگر ایسے عالم میں دنیا سے رخصت ہوئے کہ توبہ بھی نہ کر سکے تو تمہارے لئے ہلاکت ہے "

مولا فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ تمہیں بوقت موت توبہ کرنے کا موقع بھی نہ ملے جیسا کہ ہم روزمرہ کی زندگی میں برابر دیکھتے ہیں کہ ان گنت اشخاص حادثات یا

ناگہانی اموات سے دوچار ہو کر اس طرح دنیا سے رخصت ہوتے ہیں کہ انہیں توبہ کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ لہٰذا دانشمندی یہی ہے کہ انسان فرصت کے لمحات کو غنیمت سمجھے، ماضی کی کوتاہیوں کے سلسلہ میں فی الفور توبہ و استغفار کرے۔ اور ان دینی احکام پر عمل کرے جن سے توبہ قبول ہوتی ہے تاکہ بارگاہ معبود میں شرمندگی اور حساب کے موقع پر مصائب و آلام اور عتاب و عذاب سے بچ سکے، چنانچہ امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں۔

"موت کو، اس کے بعد کی منزل کو اور آخرت میں جہاں پہنچنا ہے اسے ہر وقت یاد رکھنا چاہیے تاکہ جب وہ آئے تو (اس سے قبل ہی) تم اپنا حفاظتی ساز و سامان مکمل کر چکے ہو اور اس کے لئے اپنے آپ کو تیار کر چکے ہو۔ تاکہ وہ اچانک تم پر نہ ٹوٹ پڑے کہ تمہیں بے دست و پا کر کے رکھ دے۔"

"خبردار دنیا داروں کی دنیا پرستی اور ان کی حرص و طمع جو تمہیں نظر آ رہی ہے وہ تمہیں فریب نہ دے۔"

اس دنیا کے گرویدہ لوگ، (گویا) بھونکنے والے کتے اور پھاڑ کھانے والے درندے ہیں، جو آپس میں ایک دوسرے پر غراتے ہیں، طاقتور کمزور کو نگل رہا ہے اور بڑا چھوٹے کو کچل رہا ہے۔ ان میں کچھ بندھے ہوئے جانوروں کی مانند ہیں اور کچھ کھلے ہوئے جانوروں کی طرح جنہوں نے اپنی عقلیں گم کر دی ہیں اور انجانے راستوں پر بھٹکتے پھر رہے ہیں اور دشوار گزار وادیوں میں آفتوں کی چراگاہ کے اندر انہیں آزاد چھوڑ دیا گیا ہے گویا ان کا کوئی گلہ بان ہے جو ان کی رکھوالی کرے نہ کوئی چرواہا ہے جو انہیں صحیح سمت میں چراگاہ کی طرف لے جائے۔ دنیا کی رنگینیوں نے ان لوگوں کو گمراہی کے راستے پر لگا رکھا ہے اور ہدایت کے مناروں کی طرف سے ان کی آنکھیں بند کر دی ہیں، چنانچہ اب صورت حال یہ ہے کہ یہ لوگ اسی کی گمراہیوں میں سرگرداں اور اس کی لذتوں میں غلطاں ہیں اسے ہی اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ دنیا ان سے کھیلتی رہتی ہے اور یہ دنیا کے ساتھ لہو و لعب میں لگے ہوئے ہیں اور انجام کار سے

بالکل غافل و بے خبر ہیں ۔

امیر المومنینؑ کے مذکورہ بالا کلمات میں ہمارے معاشرے کی کتنی سچی تصویر نظر آرہی ہے اس کا اندازہ ہر صاحب فکر و نظر کرسکتا ہے کیونکہ یہ وہ تصویر ہے جو اب بدیہیات میں شامل کی جاسکتی ہے۔ آج دنیا کے ہر ملک میں ہر طبقہ کے انسانوں کی اکثریت مال و زر کی فکر میں اس طرح غلطاں اور دنیا کی رنگینیوں میں اس طرح سرگرداں ہے کہ حلال و حرام کی تمیز ختم ہو چکی ہے۔ گویا جس طرح حیوانات چراگاہوں پر منہ مارتے وقت یہ نہیں سوچتے کہ یہ کس کی ملکیت ہے اور اس میں سے کھانے کی اسے اجازت ہے یا نہیں۔ اسی طرح آج کا انسان پیسے کے حصول اور دنیاوی لذتوں سے ہمکنار ہوتے وقت یہ سوچنے کی کوشش بھی نہیں کرتا کہ یہ پیسہ جائز ہے یا ناجائز اور اس کا مالک حقیقی راضی ہے یا ناراض ۔

اگر انسان اقدام کرنے سے پہلے اس بات پر غور کرلیتا کہ اس کے پروردگار نے کسی خاص مقصد کے لئے اسے پیدا کیا ہے اور اس مقصد میں کامیابی کے لئے زندگی کا ایک ضابطہ اور لائحہ عمل معین کیا ہے تو دنیا سے جرائم نافرمانیاں گمراہیوں اور بداعمالیوں کا خاتمہ ہو جاتا اور خطۂ ارض جنت نظیر بن جاتا۔ اور انسان خواہشات کا غلام بن کر نہ رہتا بلکہ ایسا آزاد ہوتا کہ خواہشات کو اپنا غلام بنا کر رکھتا، چنانچہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں

" خواہشات نفس اور دوسروں کے غلام مت بنو جبکہ پروردگار عالم نے تمہیں آزاد پیدا کیا ہے اس بھلائی میں کوئی خوبی نہیں جو برائی کے ذریعہ حاصل ہو اس آرام و آسائش میں کوئی خیر نہیں جس کے لئے ذلت کی ٹھوکریں برداشت کرنی پڑیں "

قناعت

حضرت امیر المومنینؑ علیہ السلام ارشا فرماتے ہیں ۔

"اے نور نظر وہ تھوڑا مال جو اللہ سے بے منت خلق ملے، اس مال کثیر سے بہت بہتر ہے جس کے لئے بندوں میں کسی کا ممنون احسان ہونا پڑے۔"

غور کیجیے، آجکل کتنے انسان ہیں جو اس کے مطابق زندگی گزار کر عزت نفس کی حفاظت کر رہے ہیں اور عام انسانوں کا کیا تذکرہ مسلمانوں میں ایسے افراد کتنے فی صد نظر آتے ہیں۔

ان میں کتنے فیصد افراد ایسے ہیں جو اس دستور حیات پر صدق دل سے عمل پیرا ہیں۔

امیر المومنینؑ فرماتے ہیں کہ:۔

"ناامیدی و محرومی کی تلخی کو برداشت کر لینا لوگوں کے سامنے دست سوال پھیلانے سے بہتر ہے پاک دامانی کے ساتھ محنت مزدوری کر لینا فسق و فجور میں گھری ہوئی دولت سے بدرجہا افضل ہے۔

بدترین غذا وہ ہے جو حرام ہو اور بدترین ظلم وہ ہے جو کسی کمزور و ناتواں پر کیا جائے یاد رکھو جو کچھ تمہارے مقدر میں ہے وہ تمہیں مل کر رہے گا۔ زیادہ کی امید میں اپنے آپ کو خطرات اور دنیاوی و اخروی آزمائشوں میں مت ڈالو۔ کہیں نافرمانی و عناد کی سواریاں تمہارے ساتھ منہ زوری نہ کرنے لگیں۔ کیونکہ حرص و ہوس کی کوئی انتہا نہیں ہے اور مال کی طلب اگر دل میں جگہ پیدا کرلے تو کسی طرح ختم نہیں ہو سکتی جیسا کہ امامؑ کا فرمان ہے کہ

طالب علم و طالب الدنیا"

اور امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ۔

"انسان کے اندر ہوس کی نوعیت یہ ہے کہ اگر اس کے پاس سونے کے دو پہاڑ بھی ہوں۔ جنہیں وہ ساری زندگی نہیں خرچ کر سکتا۔ تب بھی اس کی یہ تمنا ہوگی کہ کاش ایک اور ہوتا"

اور یہی حرص و ہوس معاشرے کی ان گنت بیماریوں کی جڑ ہے جو انسان کے

نفس پر اس طرح مسلط ہو جاتی ہے کہ پھر نہ خدا و رسولؐ کے احکام یاد رہتے ہیں نہ ائمہ کرامؑ کی تعلیمات پیش نظر رہتی ہیں ۔

معیاری طرز زندگی

امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں کہ اے میرے نور نظر دیکھو تمہارا طرز زندگی یہ ہونا چاہئے کہ ۔

• اگر تمہارا بھائی تم سے دوستی کا رشتہ توڑے تو تم اس سے جوڑو، وہ منہ پھیرے تو تم اس کی طرف بڑھو اور لطف و مہربانی کے ساتھ پیش آؤ ۔ وہ تمہارے ساتھ بخل کرے تو تم اس کے ساتھ سخاوت کرو وہ سختی کرتا رہے تم نرمی اختیار کرو، وہ خطا کا مرتکب ہو اور تم اس کے لئے عذر تلاش کرو ۔ اور غصے کے کڑوے گھونٹ پی جاؤ، کیونکہ میرے نزدیک نتیجہ کے اعتبار سے یہ سب سے شیریں اور خوش ذائقہ گھونٹ ہیں، اپنے دوست سے اگر تعلقات منقطع بھی ہو جائیں تو دل میں اتنی گنجائش رکھو کہ اگر اس کا رویہ بہتر ہو تو پھر تعلقات خوشگوار ہو سکیں، جو تم سے اچھی امیدیں رکھتا ہو اُسے ناامید نہ کرو ۔ اگر تمہارا دوست تم سے برائی سے پیش آئے تو تم حسن سلوک میں اس سے آگے بڑھو اور اپنے کسی بھائی کی حق تلفی نہ کرنا کیونکہ وہ بھائی کیسا جس کی حق تلفی کی جائے یا جس کے حقوق کا خیال نہ رکھا جائے یا جس کے لئے اپنے دل میں اچھے خیالات نہ رکھے جائیں ۔

اے فرزند ارجمند ۔ یاد رکھو رزق دو طرح کا ہے (۱) ایک وہ جسے تم تلاش کرتے ہو (۲) دوسرا وہ جو تمہیں تلاش کرتا رہتا ہے ۔ اگر تم اس کی طرف نہ گئے تو وہ خود ہی تم تک پہنچ جائے گا ۔

یاد رکھو ۔ مال دنیا سے بس اتنا ہی حصہ اپنا سمجھو جس سے اپنی آخرت سنوار سکو ۔ دیکھو خبردار ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جن پر نصیحت اثر ہی نہیں کرتی کیونکہ عقلمند باتوں سے مان جاتے ہیں اور حیوان لاتوں کے بغیر نہیں مانتے ۔

اگر رنج و غم ٹوٹ پڑیں تو صبر کی پختگی اور حسن یقین سے ان کا مقابلہ کرو تمہارے

ہاتھوں میں سب سے زیادہ مضبوط وسیلہ وہ ہے جو تمہارے اور اللہ کے درمیان ہے۔ یاد رکھو جو شخص دنیا پر اعتماد کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔ دنیا اسے دغا دے جاتی ہے اور جو اسے عظمت کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو اسے ذلت و پستی کی طرف لے جاتی ہے۔

راستہ سے پہلے رفیق سفر، اور گھر سے پہلے ہمسائے کے متعلق پوچھ گچھ کر لو۔ میں تمہارے دین اور تمہاری دنیا کو اللہ کے حوالے کرتا ہوں اور اس سے حال و مستقبل اور دنیا و آخرت میں تمہارے لئے بھلائی کا طلب گار ہوں۔"

مذکورہ بالا جملے مولائے کائنات کے پند و نصائح سے ایک اقتباس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کی آپؑ نے اپنے فرزند ارجمند کو وصیت فرمائی مورخین کے درمیان اس بات میں اختلاف ہے کہ یہ وصیت کس کے نام تھی اور یہ نصیحتیں اپنے بیٹے محمد حنفیہ کے نام تحریر فرمائی تھیں یا کسی اور فرزند کے نام بہر صورت مخاطب کوئی بھی فرزند ہو یہ منشور امامت تمام بنی نوع انسان کے لئے درس ہدایت ہے کہ جس پر عمل پیرا ہونے سے سعادت و کامرانی کی راہیں کھل سکتی ہیں، اور انسانیت کے بھٹکے ہوئے قافلے جادۂ ہدایت پر گامزن ہو سکتے ہیں۔

آیئے غور کریں کہ ہم جو اپنی زندگی میں قدم قدم پر حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام سے وابستگی کا دعویٰ کرتے ہیں، ان کے پند و نصائح پر کس حد تک گامزن ہیں، کیونکہ ایمان محض بلند و بالا قسم کے دعووں کا نام نہیں ہے۔ بلکہ آل محمد کو دل کی گہرائیوں سے ماننے اور ان کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کا نام ہے۔ اور سب سے بڑا احتساب، احتساب نفس ہے ہم خود ہی اپنا جائزہ لیں کہ ہم اپنے دینی بھائیوں اور برادران اسلامی کے ان حقوق کا کتنا پاس و لحاظ کرتے ہیں جن کے بارے میں ہمارے ائمہ کرام خاص طور پر مولائے کائناتؑ نے بار بار نصیحتیں بھی فرمائی ہیں اور وصیتیں بھی اور دنیا میں وہی اولاد لائق تحسین اور فرمانبردار بھی جاتی ہے جو اپنے باپ کی وصیت کو فراموش نہ کرے، ائمہ طاہرین علیہم السلام

جو ہمارے لئے ہمارے حقیقی ماں باپ سے بڑھ کر ہیں۔ ان کے ہم کتنے وفادار و فرمانبردار ہیں اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ہم ان کے فرمان پر کس قدر عمل کرتے ہیں۔ کسی انسان کے لئے بلندی و کمال کی بات تو یہ سمجھی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی سیرت و کردار میں ایسا حسن پیدا کرے کہ محمد و آل محمد کی نگاہوں میں عزت و احترام کا مستحق بن جائے کیونکہ اسی میں دنیا و آخرت کی فلاح ہے پروردگار عالم ہمیں اسوہ حسنہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین ثم آمین

جاذبہ و دافعہ
علی علیہ السلام

تصنیف

استاد شہید مرتضیٰ مطہری

ترجمہ:

غلام حسین سلیم

پیشکش شعبہ نشریات

جامعہ اہل البیت

۲.۶/۴ اسلام آباد

فون: ۸۴۳۲۵۲

باب العلم

کی

دو یادگار اشاعتیں

امام الموحدین علی ابن ابی طالب اور نہج البلاغہ کی روشنی میں

توحیدِ الٰہی

کے موضوع پر خصوصی اور یادگار اشاعت

باب العلم ⑤

رمضان المبارک میں پیش کی جائے گی۔

کلامِ امام کی روشنی میں

عدل و عدالت اور حقوقِ انسانی

اسلام کے عطا کردہ نظامِ عدل اور عصرِ حاضر میں انفرادی و اجتماعی حقوقِ انسانی کے حوالے سے خصوصی اشاعت

maablib.org

بہت جلد

انشاء اللہ العزیز